مقابلہ نمبر کے ساتھ
ایک خوب صورت تحفہ لینا ہرگز نہ بھولیے

کراچی

آنکھ مچولی

جنوری ۹۷ء - آغازِ سال نو

مقابلہ نمبر

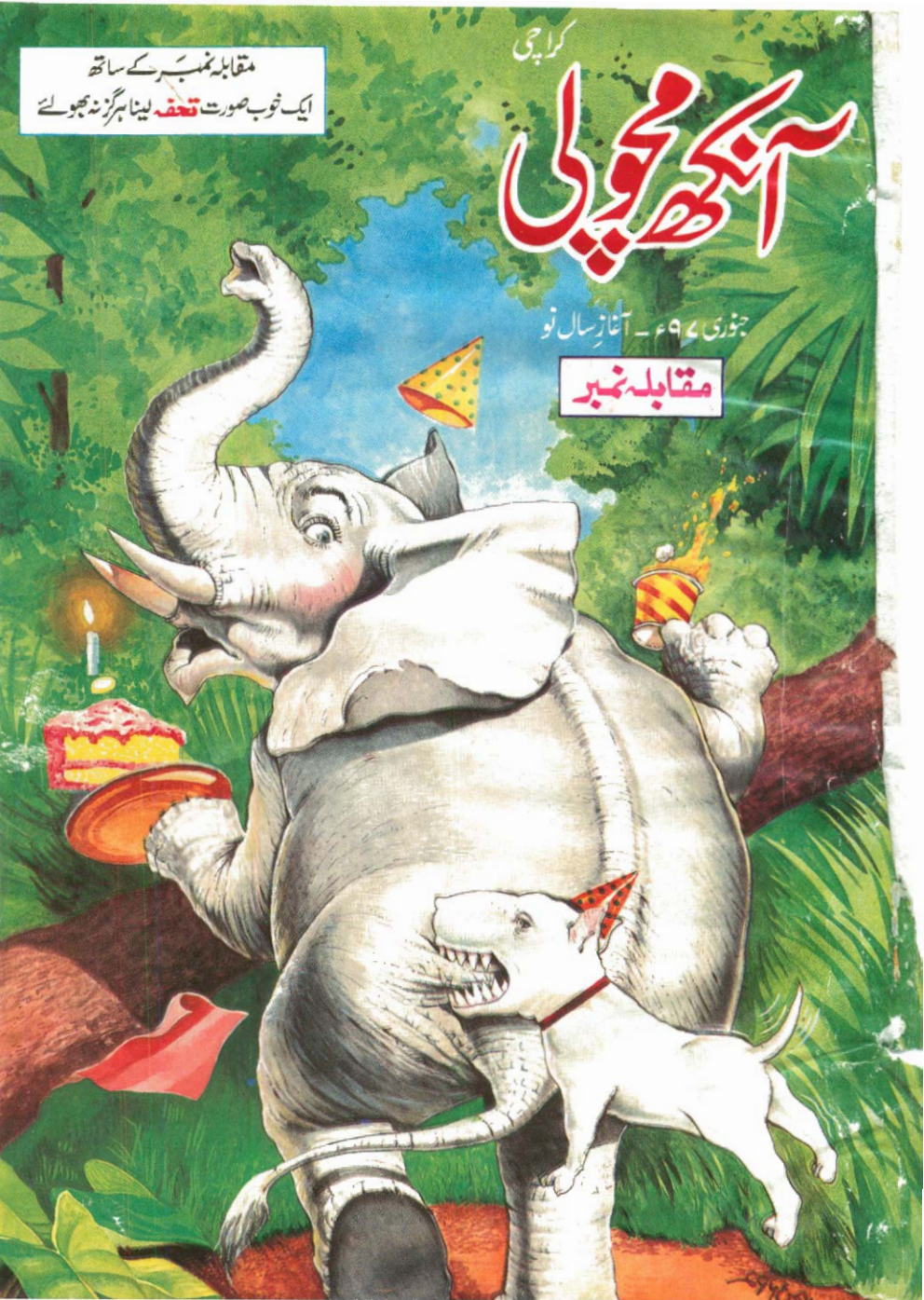

لذّت، فرحت، چاہت بھی، رنگت، ٹھنڈک، خوشبو بھی
نورس
قومی مشروب
نورس
احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی-112، نورس روڈ، سائٹ، کراچی-75700 فون، 2563520 (5 لائنیں)، فیکس 2564570-21 -92

UHU® (یوہو) کڈز کلب

دنیا کی سب سے اچھی GLUE بنانے والی مشہور زمانہ جرمن کمپنی UHU® (یوہو) نے قارئین آنکھ مچولی کے لئے پُرکشش CASH انعامات کا اعلان کیا ہے۔ درجِ ذیل سوالات کے درست جوابات ارسال کریں اور CASH انعامات حاصل کریں۔

پہلا انعام	2 ہزار روپے نقد
دوسرا انعام	1 ہزار روپے نقد
تیسرا انعام	500 روپے نقد

مقابلہ نمبر 7

قرآن پاک کس اسلامی مہینے میں نازل ہوا؟

بینسن اینڈ ہیجز ورلڈ سیریز کے میزبان ملک کا نام بتایئے؟

ہاکی کے موجودہ ورلڈ چیمپئن ملک کا نام بتایئے؟

الف، ب کا بیٹا ہے مگر ب، الف کا باپ نہیں۔ رشتہ بتایئے

شعر مکمل کیجیے:

ع یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

شرائط

1: جوابات کے ساتھ ایک عدد UHU® stic پر لپٹا ہوا پلاسٹک ریپر ضرور بھیجیں۔ 2: ایک سے زائد حل کی صورت میں ہر حل کے ساتھ UHU® ریپر بھیجنا لازمی ہے۔ 3: انعامات کا فیصلہ ایک سے زائد درست جوابات کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعہ کیا جائے گا۔ 4: انعامات کا اعلان حتمی اور ناقابل چیلنج ہوگا۔ 5: تمام حل 10 فروری تک لازمی آنکھ مچولی کے پتے پر ارسال کریں۔ 6: خوش نصیب انعام یافتگان کا اعلان مارچ کے شمارے میں کیا جائے گا۔

Don't Say GLUE — Say UHU®

مقابلہ نمبر 4 کے نتائج صفحہ نمبر 25 پر ملاحظہ کیجیے

تیار جوشاندہ

ہمدرد کی جوشینا

نئے میٹلائزڈ ساشے میں نباتاتی اجزاء اور روغنیات کے شفابخش قدرتی خواص مکمل طور پر محفوظ

زیادہ پُرتاثیر، زیادہ پُرافادیت

نزلہ، زکام، کھانسی اور گلے کی خراش کے علاج کے لیے قدرت کے شفاخانے میں جوشاندے کے نباتاتی اجزاء کی افادیت صدیوں سے مسلّمہ ہے۔
تحقیق وتجربات کی روشنی میں جدید طریقے سے حاصل کردہ جوشاندے کا خلاصہ "جوشینا" نہ صرف نزلہ، زکام، کھانسی، گلے کی خراش اور ان کے باعث ہونے والے بخار کا تدارک کرتی ہے بلکہ ان تکالیف کے خلاف قوتِ مدافعت میں بھی اضافہ کرتی ہے۔

گھر ہو یا دفتر نزلہ، زکام، کھانسی اور گلے کی خراش سے نجات کے لیے ہمدرد کی جوشینا کا ایک ساشے گرم پانی کے ایک کپ میں حل کیجیے۔

جوشاندے کی ایک مؤثر خوراک تیار ہے۔ نہ جوشاندہ اُبالنے کی زحمت، نہ چھاننے کا تردد۔

نزلہ، زکام — جوشینا سے آرام

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔
آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعات ہمدرد خریدتے ہیں۔
شہر علم وحکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

Adarts-HMD/J-1/96

انوکھے خیال اچھوتی مثال

آنکھ مچولی
کراچی

جنوری ۱۹۹۷ء

آغازِ سالِ نو

نگرانِ اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

تحقیق و تصنیف
محمد سلیم مغل
محمد جاوید خالد

امورِ انتظامی
تجمل حسین چشتی
طارق فوزی

مشاورت
ڈاکٹر طاہر مسعود

امورِ تجارت
شاہد محمود

امورِ تشہیر
عبدالرحمٰن خان
سلطان بشیر (اسلام آباد)
فون نمبر: ۲۷۸۷۲۰

شعبۂ تزئین
محمد سلیم اختر (خطاطی)
مومن رحیم (اسکیچز)
دانش اختر (پینٹنگ)

واضح رہے

۱

اس کتاب میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ (گرین گائیڈ اکیڈمی) محفوظ ہیں۔ بغیر اجازت کوئی بھی تحریر یا تصویر شائع نہیں کی جا سکتی۔

۲

اس کتاب میں شائع ہونے والی اسلامی اور تاریخی تحریروں (بشمول قرآن و حدیث) کے سوا جملہ کہانیوں کے کردار فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۳

اس کتاب کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کی نشوونما اور کردار سازی کے لیے شائع کیا۔

۴

آنکھ مچولی کا یہ کتابی سلسلہ وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہتا ہے۔

قیمت: ۲۲ روپے ۹ درہم ۹ ریال

زرِ سالانہ

پاکستان ۲۸۰ روپے (مع ڈاک خرچ)
مشرقِ وسطیٰ ۱۰۰ ریال (مع ڈاک خرچ)
۱۰۰ درہم (مع ڈاک خرچ)

ناشر: ظفر محمود شیخ
طابع: زاہد علی
مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی
فون نمبر: 4942857-4948210

محمد علی کلے

دنیا کا عظیم مسلمان باکسر، ۱۹۶۰ء میں عالمی پیشہ ور باکسر کے طور پر متعارف ہوا، دنیا کے معروف باکسر سونی لسٹن، پیٹرسن، ارنی ٹیرل، جو فریزیئر اور جارج فورمین کے علاوہ مشہور عالمی باکسرز کو شکست دی۔

خط و کتابت کا پتہ

آنکھ مچولی
گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۔پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

وقت کم ہے
مقابلہ سخت
جلدی کیجئے

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی نے

مارچ ۱۹۹۷ء میں ملک بھر کے سائل اور ادیبوں کے مابین **مقابلے** کا اعلان کیا ہے

آنکھ مچولی اس مقابلے کا خیر مقدم کرتا ہے

مقابلے میں ہم بھی شرکت کی تیاری کر رہے ہیں
آپ بھی کمر کس لیجئے

پاکستان خصوصاً اطفالِ پاکستان کے حوالے سے کہانیاں، نظمیں، مضامین اور نئے آئیڈیاز ہمیں بھجوائیے

دعوۃ اکیڈمی آپ کے لیے درج ذیل **انعامات** کا اعلان کرتی ہے

- رسائل۔ اوّل، دوم اور سوم انعام، بالترتیب شیلڈ + ۵۰۰۰، ۴۰۰۰ اور ۳۰۰۰ نقد برائے مدیران
- کہانی۔ اوّل، دوم اور سوم انعام، بالترتیب ۳۰۰۰، ۲۰۰۰ اور ۱۰۰۰ نقد نوجوان قلمکاروں کے لیے
- کہانی۔ اوّل، دوم اور سوم انعام، بالترتیب ۳۰۰۰، ۲۰۰۰ اور ۱۰۰۰ نقد خواتین قلمکاروں کے لیے
- مضمون۔ اوّل، دوم اور سوم انعام، بالترتیب ۳۰۰۰، ۲۰۰۰ اور ۱۰۰۰ نقد نوجوان قلمکاروں کے لیے
- مضمون۔ اوّل، دوم اور سوم انعام، بالترتیب ۳۰۰۰، ۲۰۰۰ اور ۱۰۰۰ نقد خواتین قلمکاروں کے لیے
- نظم۔ اوّل، دوم اور سوم انعام، بالترتیب ۳۰۰۰، ۲۰۰۰ اور ۱۰۰۰ نقد نوجوان قلمکاروں کے لیے
- نظم۔ اوّل، دوم اور سوم انعام، بالترتیب ۳۰۰۰، ۲۰۰۰ اور ۱۰۰۰ نقد خواتین قلمکاروں کے لیے
- ٹائٹل۔ اوّل، دوم اور سوم انعام، بالترتیب ۳۰۰۰، ۲۰۰۰ اور ۱۰۰۰ نقد ٹائٹل ڈیزائنر کے لیے

رسالے میں ٹائٹل ڈیزائنر کا نام لکھنا ضروری ہوگا۔

آنکھ مچولی کے توسط سے انعام حاصل کرنے والوں کے لیے

ادارہ آنکھ مچولی مزید قیمتی انعامات کا وعدہ کرتا ہے

جلدی کیجئے — وقت پر لگا کر — اڑا جا رہا ہے

آنکھ مچولی
پاکستان نمبر
اطفالِ پاکستان کے خصوصی حوالے کے ساتھ

سنہرے حروف	ادارہ	۸
پہلی بات	ڈاکٹر طاہر مسعود	۹
اسی کا ذکر ہے کوئی بیاں ہو (حمد)	سلطان محمود بجوال	۱۰
مقابلے کی آرزو	شاہ بلیغ الدین	۱۱
حق و باطل کا پہلا مقابلہ	شیخ محمد حمید عاکف	۱۳
کرکٹ کا پہلا مقابلہ	محمد صابر	۱۶
یہی تو ہے مقابلہ (نظم)	خالد بن محمود احمد	۱۸
ایک اور مقابلہ	جدون ادیب	۲۰
ہٹلر کیمپ	اطہر رضا اجنبی	۲۷
مقابلوں کے درمیاں (نظم)	الطاف حسین	۳۱
قصہ کوئز	محمد سلیم مغل	۳۲
کامیابی کا راز	طاہر نواز انصاری	۳۸
ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار (انٹرویو)	سیما صدیقی	۴۵
دیئے تم جلاؤ (نظم)	پروفیسر محمد نعیم علی خان گوہر	۵۰
مدِ مقابل	شاہد محمود	۵۱
اولمپک، پینٹاتھلون	نسرین شاہین	۵۶
نیا سال (نظم)	ضیغم حمیدی	۶۵
۲۰ سال بعد	سیما صدیقی	۶۶
پیدل مقابلے	ظفر اقبال	۷۱
ڈوئل، اعزاز کے دفاع کا مقابلہ	اسامہ بن سلیم	۷۴
محنت کی شان (نظم)	عنایت علی خان	۷۹
مقابلہ اور دعائیں	شیخ اے ایچ عابد	۸۱
مقابلے کا سفر	عشرت رضیہ رضوی	۸۳
مقابلہ ذہانت کا	منیر احمد خدوس	۸۸
طاقت کا مقابلہ	عبدالقادر	۹۲
مقابلہ حق اسکواڈ کا	اخلاق احمد	۹۴
بلیاں، بلونگڑے	فضل حق	۱۰۶
جادو کا مقابلہ	محمد جاوید خالد	۱۰۷
عاکف سے باتیں (انٹرویو)	ابو اسامہ	۱۱۳
لطیفے شطیفے	منتخب لطائف	۱۱۹
فضا میں مقابلہ (انتخاب)	ادارہ	۱۲۳
نامے میرے نام	قارئین کے خطوط	۱۲۸
لڑکیاں بہتر یا پاکستانی ہیں	(مباحثہ)	۱۳۲
جس نے تاریخ کو پلٹ دیا	طارق ریاض خان	۱۳۷
مقابلہ، تصویری کہانی	اسمار ہارون	۱۴۰
اقرأ	خالد بن محمود احمد	۱۴۶

سنہرے حروف

صلیبی لڑائیاں زوروں پر تھیں۔ عیسائی حیلے بہانے مسلمانوں پر حملے کرتے۔ چالیس دن کے محاصرے کے بعد جب عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے تو ان کی بربریت اور حیوانیت کا یہ عالم تھا کہ شہر میں ایک مسلمان کو بھی جیتا نہ چھوڑا' عورتیں' دودھ پیتے بچے سب موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ آخر کب تک یہ سلسلۂ ظلم جاری رہتا۔ اللہ نے صلاح الدین ایوبی کو پیدا کیا۔ اس نے مسلسل چودہ سال تک صلیبیوں سے جہاد کیا۔ اس نے میدان جنگ میں مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار ہی دوبارہ بحال نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کا خون جو پانی کی طرح بہایا جارہا تھا' اس ظلم کو بھی روکا۔

ایک معرکے میں ایک بیقرار ماں اپنے بال نوچتی اور سر پیٹتی اپنے بچے کو ڈھونڈنے نکلی۔ وہ کسی عیسائی سپاہی کی بیوی تھی۔ بندی میں اس کا بچہ پکڑا گیا تھا۔ یہ اپنی جگہ کوئی انوکھا واقعہ نہ تھا۔ فرنگی تو روز ہی مسلمانوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے ماں بچے کے لئے سخت بے قرار تھی۔ وہ اپنی فوج کے ایک ایک افسر کے پاس گئی کہ کسی طرح اس کا بچہ واپس مل جائے۔ لیکن کوئی صورت نہ بنی۔ کسی نے اسے مشورہ دیا کہ "تم مسلمانوں کے پڑاؤ میں چلی جاؤ اور وہاں فریاد کرو۔ اگر سلطان صلاح الدین کے کانوں میں تمہارے رونے کی آواز پڑجائے تو سمجھ لو کہ تمہارا بچہ مل گیا" عورت نے کہا۔ "سلطان تو ہمارا دشمن ہے!" جواب ملا۔ "وہ ہمارا دشمن ضرور ہے لیکن بڑا شریف دشمن ہے۔ وہ بڑا بہادر آدمی ہے' اللہ نے اسے مرتبے کے ساتھ ساتھ بڑا ظرف بھی دیا ہے وہ کسی کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔"

عورت بے قرار تو تھی ہی بے اختیار مسلمانوں کے پڑاؤ میں گئی اور کسی نہ کسی طرح سلطان تک پہنچ گئی۔ سلطان نے دیکھا ماں اپنے جگر گوشے کے لئے پریشان ہے تو خود بے قرار ہو کر اٹھا۔ فوج میں تلاش کرایا۔ اس آدمی کو ڈھونڈ نکالا جس نے قیدی بچے کو خریدا تھا۔ اپنے پاس سے اس کی قیمت ادا کی بچے کو واپس لیا خود چل کر اس کی ماں کے پاس گیا اور بچہ اس کے حوالے کردیا۔ وہ دعائیں دیتی رخصت ہونے لگی تو حکم دیا کہ

"اسے گھوڑے پر سوار کرا کے عزت سے اس کے کیمپ میں پہنچادو۔"

مرسلہ : جنید اختر' کراچی

پہلی بات

ڈاکٹر طاہر مسعود

وہ عجیب بھوندو لڑکا تھا۔ پڑھنے لکھنے، کھیلنے کودنے غرض ہر کام میں پیچھے۔ ماں باپ، اساتذہ، رشتہ دار سبھی سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے، مگر ڈھاک کے تین پات، اسے تو کسی کام سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ کلاس میں پچھلی میز پر بیٹھا ہونقوں کی طرح بلیک بورڈ تکتا رہتا۔ کھیل کے میدان میں جب لڑکے بالے آسمان سر پر اٹھائے ہوئے، یہ اپنے گھر میں دبکا رہتا۔ اور ہر امتحان میں بھی ناکام ہو جاتا۔ اس کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر ایک دن اس کے والد نے تنگ آکر کہا،

"بیٹا! تم آخر چاہتے کیا ہو؟ اگر تمہارے طور طریقے یہی رہے تو پھر تم دنیا میں کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔"

پتا نہیں وہ کیسا لمحہ تھا، باپ کے کہے ہوئے جملے لڑکے کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گئے۔ اس نے سوچا، "مجھے کچھ کر کے دکھانا چاہئے۔ مجھے اپنے ابو کو مایوس نہیں کرنا چاہئے۔" اس دن سے وہ پہلے والا لڑکا نہیں رہا۔ اچھے نمبروں سے وہ امتحان میں بھی کامیابی حاصل کرتا گیا اور ایک دن مشہور شخصیت کا مالک بنا۔ بھلا آپ جانتے ہیں یہ لڑکا کون تھا؟ کوئی بھی ہو، اصل بات جاننے کی یہ ہے کہ آدمی کسی مقام پر اسی وقت پہنچتا ہے جب اس میں جدوجہد کرنے کا جذبہ ہو۔

جدوجہد کا مطلب ہے، مقابلہ کرنا۔ حالات کا مقابلہ، مشکلات کا مقابلہ، دوسروں کا مقابلہ۔۔۔۔ یعنی اپنے کام کو دوسروں سے بہتر انداز میں انجام دینے کی کوشش کرنا۔۔۔ غور کیجئے تو مقابلے ہی سے زندگی کی رونق ہے۔۔ مقابلہ نہ ہو تو زندگی ٹھہر جائے۔۔۔ آج دنیا میں جتنی ترقی نظر آرہی ہے، اسی کی وجہ یہی مقابلے کا جذبہ ہے۔ مقابلہ کرنے سے جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ محنت کرنے کے لئے، آگے بڑھنے کے لئے اور کامیاب ہونے کے لئے۔ گویا کامیاب وہی ہوتا ہے جو مقابلہ کرتا ہے۔

مقابلہ جہاں اچھی چیز ہے وہیں بری چیز بھی ہے۔ خصوصاً" اس وقت جب مقابلہ بری باتوں اور بری عادتوں سے شروع ہو جائے۔ مثلاً" دیکھنے میں آیا ہے کہ لڑکے بالے ایک دوسرے سے کپڑے پہننے میں مقابلہ کرتے ہیں، ہیئر اسٹائل بنانے میں مقابلہ کرتے ہیں، دوسروں پر رعب ڈالنے کے لئے فضول خرچی میں مقابلہ کرتے ہیں اور کچھ نہیں تو سڑک پر موٹر سائیکل تیز بھگانے کا مقابلہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ سب شیطانی مقابلے ہیں اور ان میں سراسر نقصان ہے۔ فائدہ کوئی نہیں۔ مقابلہ اچھی باتوں میں ہونا چاہئے۔ مثلاً" لکھنے پڑھنے میں امتحان میں اچھے نمبر لانے میں، میچ جیتنے میں، دوسروں کی مدد کرنے میں، کوئی نمایاں کارنامہ انجام دینے میں اور سب سے بڑھ کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماننے میں، آپس میں مقابلہ کرنا چاہئے۔ ایسے مقابلے سے آدمی کی عزت بڑھتی ہے۔ اور دینی و دنیاوی دونوں کامیابیاں ہاتھ آتی ہیں۔

اسی کا ذکر ہے

سلمان محمود رجوال

اسے جس نام سے چاہو کرو یاد
کہ نام اس کا ہے سب ناموں کی بنیاد
وہ اچھا اور اس کا نام اچھا
خود اچھا، بات اچھی، کام اچھا
اسی کے نام سے باقی ہیں سب نام
اسی کی یاد سے چلتے ہیں سب کام
اسی کی ذات ہے ہر ذات کی جان
اس کی بات ہے ہر بات کی کان
اسی کا نام ہے کوئی زباں ہو
اس کا ذکر ہے کوئی بیاں ہو

مقابلے کی آرزو

شاہ بلیغ الدین

احد کی پہاڑی سامنے تھی۔ ریتیلا میدان پھیلا ہوا تھا۔ فوجیں میدان جنگ میں ایک دوسرے کے سامنے ڈٹی کھڑی تھیں۔

دو دوست اپنی صفوں سے نکل کر ایک طرف کھڑے ہوگئے اور چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ کچھ معلوم نہیں کیا باتیں کرتے رہے۔ دونوں مسلمان تھے، دونوں اللہ کے سپاہی تھے یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص اور فرماں بردار ساتھی، جو سر سے کفن باندھ کر میدانِ جنگ میں آئے تھے۔ دل میں ایک ہی تمنا تھی کہ ملت پر امتحان کی گھڑی آئی ہے تو ہم کو جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑنا چاہیے۔ میدان جنگ تو میدان جنگ ہی ہوتا ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس کا کیا انجام ہوگا۔ زندگی اور موت کے رشتے میں یہاں بہت کم فاصلہ رہتا ہے۔

ان دونوں دوستوں نے کہا" آؤ دعا مانگتے ہیں، دل حاضر ہیں، اللہ سے لَو لگی ہے۔ کیا عجب کہ اس وقت زبان سے نکلے ہوئے فقرے بارگاہ الٰہی میں قبولیت حاصل کرلیں۔" چنانچہ دونوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔ ایک نے دعاء شروع کی، بولا "یااللہ! جب دشمنوں سے میرا مقابلہ ہو تو ایسا شخص میرے سامنے آئے جو تیرو تلوار کا دھنی ہو، جرأت و ہمت کا مالک ہو! بجلی کی

طرح لپکے' بادل کی طرح گرجے' میرا اس سے پالا پڑ جائے' مقابلہ ہو اور ایسا مقابلہ کہ جو دیکھے بس دیکھتا ہی رہ جائے' کانٹے کی لڑائی اور ایک ایک قدم ناپا تلا اٹھے' آفت کا مرحلہ ہو اور قیامت کا امتحان۔ ایسے میں مالک الملک مجھے ثابت قدم رکھنا۔ میرے دست و بازو میں شہپر جبریل کی قوت دینا۔ میں انگارے کی طرح اڑوں' دشمن پر جا گروں حملے سخت سے سخت تر ہو جائیں' بچاؤ تیز سے تیز تر ہو جائے حتیٰ کہ مولا تو مجھے اس پر غالب کر دے۔ میں اسے پیٹ لوں' میرا لڑنا تیرے لئے ہو اور تو میرے اس جہاد کو قبول فرمالے!!"

ایک دوست یہ دعا مانگتا رہا۔ دوسرے کی زبان سے "آمین' آمین" کے الفاظ نکلتے رہے۔ یہ دعا مانگنے والے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ حضرت سعدؓ کی دعا ختم ہو گئی تو ان کے دوست نے دعا مانگنی شروع کی۔ اب حضرت سعدؓ آمین کہنے لگے۔

دوسرے دوست نے دعا کی کہ ....."الٰہی معرکہ آرائی کو نکلوں تو میرے مقابل بھی ایک ایسے مردِ میدان اور ایسے جیالے کو بھیج جو جانِ جوانانِ جری ہو پھر میرا اس سے مقابلہ ہو۔ ایسا مقابلہ کہ معلوم ہو پہاڑ پہاڑ سے ٹکرا رہا ہے' تلواروں سے آگ برسے' نیزوں سے شعلے لپکیں' میرا لڑنا تیرے لئے ہو' آخر وہ میرا حریف مجھ پر پل پڑے' پھر وہ موقع آجائے کہ تیرے کرم سے دین کی راہ میں مجھے جامِ شہادت پینے کا موقع ملے' یہی نہیں وہ مجھے مار کر میری ناک کاٹے' میرے کان کاٹے' میری لاش کی بے حرمتی کرے' پھر جب میں اے اللہ! تیرے سامنے حاضر ہوں اور تو پوچھے کہ ..... "اے عبداللہ! بتا تیری ناک کیوں کاٹی گئی؟" تو میں کہوں کہ ....."مولا! تیرے لئے۔" تو پوچھے "کان کیوں کاٹے گئے؟" "تو میں کہوں کہ ....."مولا! تیرے اور تیرے رسولؐ کے لئے۔" اور تیری بارگاہ سے آواز آئے ....."اے عبداللہ تو نے سچ کہا!"

طبقات ابن سعد اور طبری میں ہے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ ہم دونوں کی دعائیں قبول ہوئیں۔ عبداللہ بن جحشؓ اسی طرح شہید ہوئے جیسی انہوں نے دعا مانگی تھی۔ ان کے ناک کان کاٹے گئے' انہیں سید الشہدا حضرت امیر حمزہؓ کے ساتھ ساتھ ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔

سعد بن ابی وقاصؓ جب بھی انہیں یاد کرتے کہتے ....."حق یہ ہے کہ ان کی دعا میری دعا سے بہتر تھی۔"

●●●

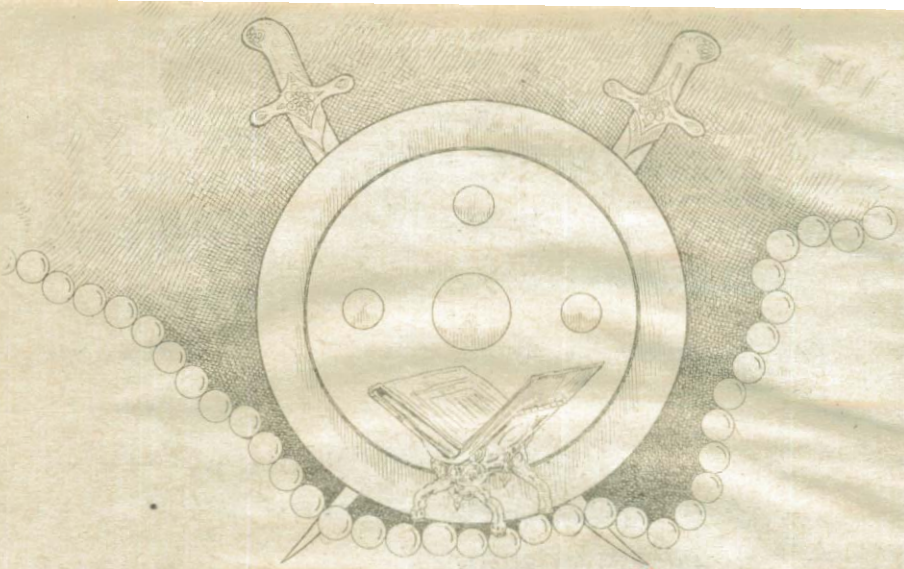

حق و باطل کا پہلا مقابلہ

شیخ محمد عاکف حسین

رحمت عالمؐ جب مکہ سے مدینہ ہجرت کر گئے تو انہیں علم تھا کہ جمہوریہ مدینہ کو سب سے زیادہ خطرہ اہلِ مکہ سے ہے۔ اس خطرے کا راستہ روکنے کے لئے قریش کے ارادوں سے باخبر رہنا ضروری تھا۔ مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں قریش کے تجارتی راستہ کی طرف بھیجی گئیں تاکہ وہ پرانے واقف کاروں سے رابطہ کریں اور مفید معلومات حاصل کریں۔

اسی اثناء میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے حالات کا رخ یک دم پلٹ دیا۔ مسلمانوں کی ایک جماعت کو نخلہ کی طرف بھیجا گیا تاکہ دشمن کے ارادوں سے باخبر رہا جاسکے۔ اس جماعت کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ کسی کا خون نہ بہائے لیکن اس جماعت کی مڈبھیڑ قریش کی ایک جماعت کے ساتھ ہوگئی جس میں حضرمی نامی ایک قریشی مارا گیا۔ جب یہ خبر آنحضرتؐ کو پہنچی تو آپؐ کو بڑا دکھ ہوا۔ آپؐ نے اعلان فرمایا کہ "جن لوگوں نے یہ خون بہایا ہے میں ان کے فعل سے بری الذمہ ہوں۔"

قریش حملہ کرنے پر تلے بیٹھے تھے انہوں نے حضرمی کے قتل کو آڑ بنایا اور فوراً مدینے پر چڑھ دوڑے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ قریش کا لشکر بڑھا آرہا ہے تو آپؐ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کرکے صورت حال سے آگاہ کیا اور فرمایا : "لوگو مجھے اپنی رائے سے آگاہ کرو۔" فوراً" بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔" ہم کافروں کے ساتھ جنگ کریں گے۔"

رحمت عالمؐ نے اپنا سوال تین بار دہرایا۔ جب آپؐ نے تیسری بار اپنا سوال دہرایا تو انصار کے سردار حضرت سعدؓ کھڑے ہوئے اور بولے :

"اللہ تعالیٰ کے رسول آپؐ اپنے منصوبے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر دشمن کو روکیں۔ ہم آپ کے دائیں، آپ کے بائیں، آپ کے آگے اور آپ کے پیچھے لڑیں گے۔ خدا کی قسم! اگر آپؐ حکم دیں کہ سمندر میں سے گزر جاؤ تو ہم سمندر میں سے گزریں گے۔ ہم میں سے ایک آدمی بھی پیچھے نہیں رہے گا؟"

یہ الفاظ سن کر رحمت عالمؐ کا چہرہ مبارک چمک اٹھا۔

رحمت عالمؐ اپنی فوج لے کر مدینہ سے نکلے اس میں صرف ۳۱۳ جاں نثار شامل تھے۔ اس فوج کے پاس فقط ستر اونٹ اور چند گھوڑے تھے۔ صرف چند آدمیوں کے پاس زرہ بکتر تھے۔ باقیوں کے پاس تلواروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے مقابلے میں قریش کی فوج ایک ہزار بہادروں پر مشتمل تھی۔ جو تقریباً" سب کے سب لوہے میں ڈوبے ہوئے تھے اس کے علاوہ ان کے پاس ۷۰۰ اونٹ اور ۳۰۰ گھوڑے تھے۔

قریش کا لشکر آگے بڑھتا ہوا مدینے سے اسی میل دور بدر کے مقام تک پہنچ گیا۔ اور رحمت عالمؐ بھی اپنے مٹھی بھر جاں نثاروں کو لے کر یہیں پہنچ گئے۔

جمعہ کا دن تھا اور رمضان المبارک کی ساتویں تاریخ، جب دونوں فوجیں زور آزمائی کے لئے تیار ہوئیں رحمت عالمؐ نے مسلمانوں کی صفیں خود درست کیں۔ اس کے بعد آپؐ اپنے حجرے میں تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور سجدے میں گر گئے۔ آپؐ پر بے خودی طاری تھی اور بار بار فرماتے تھے۔

"اے اللہ، اگر آج یہ ۳۱۳ افراد ختم ہو گئے تو دنیا میں تیری پوجا کے لئے کوئی باقی نہیں رہے گا۔ ان لوگوں کی مدد فرما تاکہ دنیا میں سچائی اور انصاف باقی رہے۔"

مقابلہ شروع ہوا۔ قریش کا نامی گرامی سردار عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کو ساتھ لے کر میدان میں اترا اور مسلمانوں کو

مقابلے کے لئے للکارا۔ادھر سے تین انصاری مقابلے کو نکلے اس پر عتبہ نے پکار کر کہا "محمدؐ! مدینے کے یہ کسان ہمارے پلے کے نہیں ایسے آدمی بھیجو جو ہمارے ہمسر ہوں۔" یہ سن کر رحمت عالمؐ کے چچا حمزہؓ آپ کے چچیرے بھائی حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ میدان میں آئے۔ حضرت حمزہؓ نے عتبہ کا کام تمام کردیا اور حضرت علیؓ نے اس کے بیٹے ولید کا۔

پھر عام مقابلہ شروع ہوگیا۔ قریش کا ٹڈی دل مٹھی بھر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ ایک مسلمان کے مقابلے میں تین تین کافر موجود تھے۔ پھر کافروں کے پاس اسلحہ اور سازوسامان کی ریل پیل تھی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن مسلمانوں کے بازوؤں میں اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب و غریب طاقت بھر دی تھی۔ ان کے دلوں میں وہ جرأت کی وہ آگ بھڑک رہی تھی جو شیروں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔

دو چھوٹے سے انصار لڑکوں نے قریش کے سردار ابوجہل کو تلاش کیا اور اگلے لمحے ہی اس دشمنِ رسولؐ کا سر زمین پر پڑا تھا۔

مسلمان لڑائی کے میدان میں بہادری کی داد دے رہے تھے اور رحمت عالمؐ سجدے میں گرے تھے۔ آپؐ رو رو کر دعائیں مانگ رہے تھے۔

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپؐ کو فتح کی خوش خبری دی۔ رحمت عالمؐ مسکراتے ہوئے سجدے سے اٹھے اور صحابہؓ کو یہ خوش خبری سنائی۔

ابوجہل اور دوسرے سرداروں کے مارے جانے سے قریش کے حوصلے جواب دے گئے۔ ان کی صفیں ٹوٹ گئیں اور وہ تتر بتر ہو کر میدان سے بھاگ نکلے۔ ان کے ستر آدمی مارے گئے، جن میں چوٹی کے سردار شامل تھے۔ اتنے ہی آدمی قیدی بنائے گئے۔

اس کے مقابلے میں صرف چودہ مسلمان شہید ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کردیا اور مٹھی بھر مسلمانوں کو ان کی بے سروسامانی کے باوجود مکمل فتح عطا فرمائی۔

رحمت عالمؐ ایک فاتح کی حیثیت سے مدینے کو لوٹے لیکن فتح کی خوشی میں نہ شادیانے بجائے گئے، نہ نمائشی جلوس نکالے گئے۔ آپؐ کا سر عاجزی سے جھکا تھا اور اللہ تعالیٰ کی تعریفیں آپؐ کی زبان پر تھیں۔ یہ فتح اللہ تعالیٰ نے دی تھی اور بے شک وہی ساری تعریفوں کا حق دار ہے۔

کرکٹ کا پہلا مقابلہ

محمد صابر

کرکٹ کا کھیل اپنی سنسنی خیزی، تجسس اور دلچسپی کے باعث دیگر تمام کھیلوں پر حاوی ہے۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے جو ہر نئے لمحے میں ایک نئے ریکارڈ (Record) کو جنم دیتا ہے اور ہر آنے والا دن ایک نئی تاریخ رقم کرتا ہے۔

15 مارچ سنہ 1877ء ایک ایسا ہی تاریخ ساز دن تھا جب دنیائے کرکٹ کا پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا گیا۔ کرکٹ کے اس اولین ٹیسٹ میچ کے مقابلے میں برطانیہ اور آسٹریلیا کی ٹیمیں صف آراء تھیں اور یہ تاریخی میچ آسٹریلیا کے شہر آفاق میدان "ملبورن کرکٹ گراؤنڈ" پر کھیلا گیا۔ 15 مارچ سے 19 مارچ تک جاری رہنے والے اس ٹیسٹ میچ میں امپائر کے فرائض سی اے ریڈ (C.A.REID) اور آر۔ بی ٹیری (R.B.TERRY) نے انجام دیئے۔

15 مارچ بروز جمعرات ٹھیک 10 بج کر پانچ منٹ پر آسٹریلیا کی ٹیم نے سب سے پہلے بیٹنگ کرکے اننگ کا آغاز کیا۔ انگلینڈ کے بالر الفریڈ شا نے آسٹریلوی اوپنر چارلس بینرمین (MAN BANNER) کو ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ کی پہلی گیند کرانے کا اعزاز حاصل کیا۔ چارلس بینر مین پہلی گیند پر کوئی رن نہ بنا سکے تاہم الفریڈ شا

کی دوسری گیند نے انہیں ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ کے ایک اہم اعزاز کا مستحق بنادیا اور وہ اعزاز تھا ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ کے پہلے رن کا حصول۔

آسٹریلیا نے اپنی پہلی اننگ میں 245 رن بنائے جس میں چارلس بینرمین کے شاندار 165 رنز شامل تھے۔ بینرمین مجموعی طور پر 4 گھنٹے 45 منٹ تک کریز پر رہے اس دوران انہوں نے 15 خوبصورت چوکے بھی لگائے۔

انگلینڈ نے آسٹریلیا کے 245 رنز کے ہدف کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی اننگ کا آغاز کیا۔ انگلینڈ کے بلے بازوں کی مایوس کن کارکردگی اور آسٹریلیا کی عمدہ بالنگ کے سبب انگلینڈ کی ٹیم اپنی پہلی اننگ میں صرف 196 رنز بنا سکی۔ اس طرح انگلینڈ کی ٹیم کو 49 رنز کا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔

انگلینڈ کی مایوس کن کارکردگی نے آسٹریلوی ٹیم کو ایک نیا حوصلہ دیا۔ اب آسٹریلیا کی ٹیم اس پوزیشن میں تھی کہ وہ انگلینڈ کے لئے رنز کا طویل ہدف قائم کرسکے۔ مگر اس مرتبہ آسٹریلیا کو اس کے بلے بازوں کی غیر تسلی بخش کارکردگی نے مایوس کیا اور پوری ٹیم محض 104 رنز بنا سکی۔

چارلس بینرمین جنہوں نے پہلی اننگ میں 165 رنز بنائے تھے صرف 4 رنز بنا سکے جبکہ آسٹریلیا کی دوسری اننگ کا سب سے بڑا اسکور ٹی پی ہوران (T.P - HROAN) نے کیا جو صرف 20 رنز تھا۔

انگلینڈ کو اپنی دوسری اننگ میں دنیائے کرکٹ کا پہلا ٹیسٹ میچ جیتنے کے لئے صرف 154 رنز درکار تھے۔ جو بہ ظاہر آسان تھا۔ انگلینڈ کی ٹیم نے میچ میں فتح یاب ہونے کے لئے انتہائی تگ ودو کی اور ان کے بلے بازوں نے اپنی تمام صلاحیتیں میچ جیتنے پر صرف کردیں۔ مگر شاید قسمت ان پر مہربان نہ تھی اور دنیائے کرکٹ کے اس تاریخی میچ میں فتح آسٹریلوی ٹیم کا مقدر بن گئی۔ آسٹریلیا کے کھلاڑیوں کی بہترین بالنگ کے باعث انگلینڈ کی پوری ٹیم 108 رنز کے مجموعی اسکور پر ڈھیر ہوگئی۔ آسٹریلیا نے انگلینڈ کو اس ٹیسٹ میچ میں 45 رنز سے شکست دی۔ اس تاریخ ساز ٹیسٹ میچ میں اسپورٹ مین اسپرٹ کا شاندار مظاہرہ سامنے آیا۔ اس کے ساتھ ہی ملبورن کرکٹ گراؤنڈ پر موجود شائقین کرکٹ کا انہماک بھی قابل دید تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ٹیسٹ میچ کے آخری دن ملبورن کرکٹ گراؤنڈ پر موجود تماشائیوں کی تعداد تین ہزار سے زائد تھی۔ اور 1877ء میں یہ ایک ٹھیک ٹھاک تعداد تھی۔

●●●

یہی تو ہے مقابلہ

خالد بن محمود احمد

یہ زندگی سوال ہے سوال سے فرار کیوں
فرار تو محال ہے قدم بڑھا، جواب لا،
یہی تو ہے مقابلہ

یہ زندگی ہے امتحاں ہے امتحاں تو پیش کر
عمل کا، عزم کا نشاں جہاد کا نصاب لا،
یہی تو ہے مقابلہ

یہ زندگی ہے اک چمن چمن میں خار ہیں مگر
گلوں کی دل میں رکھ لگن خیال میں گلاب لا،
یہی تو ہے مقابلہ

یہ زندگی تو آس ہے اگر ہے آس ٹوٹتی
تو ہوتا کیوں اداس ہے تُو پھر سے تازہ خواب لا،
یہی تو ہے مقابلہ

یہ زندگی عجیب ہے نہیں ہے دل میں روشنی
تو پھر بہت غریب ہے کہیں سے آب و تاب لا،
یہی تو ہے مقابلہ

سلیمان خان

زندگی کا ہر لمحہ جہد سے عبارت ہو

بازوؤں میں قوت ہو آنکھ میں بصارت ہو
زندگی کا ہر لمحہ جہد سے عبارت ہو
اس مقابلے میں جو جان تک لڑائے گا
زندگی کی رسی کو کھینچ کھینچ لائے گا
وہ ہی سرخرو ہوگا وہ ہی جیت جائے گا

ایک اور مقابلہ

جدون ادیب

سود خور بنیا، رام دیال سخت لہجے میں کہہ رہا تھا "اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا سود ملا کر ننانوے روپے بارہ آنے اگر کل شام تک ادا نہ کیے تو گروی رکھا یہ مکان میرا ہو جائے گا سمجھے .....!"

رامو نے جھکا ہوا سر اٹھایا ایک نظر ماں کی

طرف دیکھا جو ذلت و بے عزتی کے احساس سے سر جھکائے بیٹھی تھی رام دیال ان کا ہم مذہب تھا لیکن اس وقت تو وہ پیسے کا پجاری تھا' صرف پیسے کا۔ ماں سے نظریں ہٹا کے اس نے رام دیال کے بے حس چہرے کی طرف دیکھا اور کہا' "کل تک آپ کی رقم کا بندوبست ہو جائے گا.....!"

رام دیال مکروہ ہنسی ہنسا "بھگوان کی کرپا (مہربانی) سے۔"

ایک لمحہ توقف کے بعد وہ بولا "لیکن اگر تم مقابلہ ہار گئے تو....."

رامو کے چہرے پر ایک تاریک سایہ سا آکر گزر گیا مگر وہ پرجوش لہجے میں بولا "میں یہ مقابلہ ضرور جیتوں گا.....!"

"دیکھ لیں گے"۔ رام دیال نے لاپروائی سے کہا اور پھر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے اس کی ماں سے مخاطب ہوا "اچھا بہن میں چلتا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد رامو کافی دیر تک گم صم سوچتا رہا پھر وہ اٹھا' کمرے میں جا کر اس نے کاپی نکالی اور آہستہ آہستہ کچھ لکھنے لگا۔

☆ --- ☆ --- ☆

علی مقابلے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ تھا دل کی بے قابو دھڑکنیں اسے کبھی خوشی و مسرت کا احساس دلاتیں اور کبھی انجانے خدشات اسے خوفزدہ کر جاتے!

"کیا میں یہ مقابلہ جیت جاؤں گا؟" اس نے خود سے سوال کیا!

بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ "انشاء اللہ"

دروازے پر دستک سن کر اس نے دروازہ کھولا' ایک بچہ کھڑا تھا اس نے ایک لفافہ علی کی طرف بڑھایا اور بولا "یہ لفافہ آپ کے ایک دوست نے دیا ہے اور کہا ہے کہ اسے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ضرور پڑھ لیں۔"

علی نے لفافہ لے کر اس کا جائزہ لیا' وہ اسے چاک کرنا چاہتا تھا کہ نہ جانے کیا سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

پھر وہ مسکرا دیا۔

"یقیناً" میرے کسی ہمدرد کا خط ہے جو مقابلے میں فتح کے لئے حوصلہ افزائی کی خاطر لکھا گیا ہو گا۔" اس نے سوچا

ماں کی آواز سن کر وہ ان کی طرف بڑھا۔ ماں نے جائے نماز پر بیٹھے بیٹھے کچھ پڑھ کر اس کی طرف پھونکا اور اس کی کامیابی کے لئے دعا مانگی!

گلی میں ڈھول بجانے اور شور شرابے کی آواز سن کر علی کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ماں وہ لوگ آگئے.....!"

"جا بیٹا اللہ تجھے فتح سے ہمکنار کرے!" ماں نے اس کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ "ماں میں ضرور جیتوں گا! ہمارے سارے دکھوں کا مداوا آج کی جیت میں ہے میں جیتوں گا تو ہماری گڑیا کا علاج بھی ہوگا۔" کہتے کہتے اس کا لہجہ بھرا گیا اور وہ ماں کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے باہر نکل گیا۔

گھر سے نکلتے ہی سب نے زوردار نعروں سے اس کا استقبال کیا۔ ڈھول کی آواز میں اور شدت پیدا ہوگئی ایک نوجوان نے علی کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیا باقی نوجوان آگے آگے بھنگڑا ڈالتے جارہے تھے۔ ان کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔

☆ --- ☆ --- ☆

علی اور رامو دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے! رنگ (اکھاڑے) کے آس پاس بہت سے لوگ جمع تھے۔ لوگوں کے دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک علی کی حمایت میں نعرے لگا رہا تھا اور دوسرا رامو کی حمایت میں۔

ہر سال کی طرح اس سال بھی یہ چھوٹا سا علاقائی مقابلہ منعقد ہوا تھا مگر اس سال اس میں تعصب کا رنگ شامل ہوگیا تھا۔ اب یہ عام سا مقابلہ نہیں رہا تھا کیونکہ اب وقت بدل چکا تھا۔ تحریکِ پاکستان آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی اور ہندو تعصب کھل کر سامنے آگیا تھا اور اب یہ مقابلہ ہندو مسلم مقابلہ بن چکا تھا اس مقابلے کے فاتح کو انعام میں سو روپے نقد ملنا تھے!

علی اور رامو دونوں یہ مقابلہ جیتنا چاہتے تھے کیونکہ سو روپیہ دونوں کی ضرورت تھی لیکن اس کے علاوہ بھی یہ نظر آرہا تھا کہ دونوں ہی یہ تہیہ کر چکے ہیں کہ وہ ہر حال میں جیتیں گے کیونکہ اب یہ مقابلہ دو لڑکوں کی بجائے دو قوموں کے مقابلے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

ریفری نے مقابلہ شروع کرنے کا سگنل دیا اور دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے' تماشائیوں کے جوش و اضطراب میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔

لڑتے لڑتے علی نے اچانک رامو کی گردن بغل میں دبوچ لی' رامو نے تڑپ کر دونوں ہاتھ علی کے پیٹ پر باندھے اور اسے ایک جھٹکے سے اٹھا کر دوسری طرف پھینکنا چاہا مگر علی نے تھوڑا سا جھک کر تیزی سے خود کو جھٹکا دیا اور اگلے ہی لمحے وہ رامو کی گرفت سے نکل آیا ساتھ ہی اس نے جھک کر رامو کو اٹھانے کی کوشش کی مگر رامو

تیزی سے پیچھے ہٹا اور اس نے اپنا گھٹنا علی کے منہ پر دے مارا۔

علی کے منہ اور ناک سے خون جاری ہوگیا۔

دیسی کشتی یکایک ہی فری اسٹائل میں تبدیل ہوگئی تھی!

ریفری کو مسلمان تماشائیوں کے احتجاج پر یہ مقابلہ روک کر ہنگامی اعلان کرنا پڑا کہ "اب دونوں کسی بھی انداز میں لڑسکتے ہیں۔"

علی نے ناک سے خون صاف کرکے ایک طرف تھوکا اور آگے بڑھا۔ رامو نے لپک کر ایک گھونسا علی کے منہ پر اور رسید کردیا۔ علی ایک لمحہ کو لڑکھڑا گیا۔ رامو نے دوسرا گھونسا مارنا چاہا مگر علی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے موڑ دیا اور دوسرے ہاتھ سے وہ دیوانہ وار رامو کے پیٹ پر گھونسے برسانے لگا۔

رامو تکلیف کی شدت سے دہرا ہوگیا۔علی نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ایک جھٹکے سے رامو کو سیدھا کیا اور ایک پٹخنی دے کر اس کی پیٹھ زمین سے لگا دی۔ اگلے ہی لمحے ریفری نے علی کا ہاتھ اٹھا کر اس کی فتح کا اعلان کردیا۔

مسلمان تماشائی رنگ میں داخل ہوگئے اور دیوانوں کی طرح رقص کرنے لگے۔ علی کو انہوں نے اپنے کاندھوں پر اٹھالیا تھا.....

☆ --- ☆ --- ☆

"ماں! میں جیت گیا.....!" علی نے گھر میں داخل ہوتے ہی نعرہ لگایا ماں نے مسکراتے ہوئے علی کی طرف دیکھا اور کہا "تیری فتح کا مجھے پہلے ہی سے یقین تھا بیٹے اور جب ہندوؤں نے اس مقابلے کو غلط رنگ دیا تو میرا یقین پختہ ہوگیا کیونکہ حق و باطل کی جنگ میں فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے!"

علی نے ماں کے ہاتھ چومے اور ایک تھیلی میں رکھے ہوئے روپے ماں کے قدموں میں رکھ دیئے۔کمرے میں میز پر رکھے خط کو دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ اسے پڑھ نہیں سکا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے خط کھولا اور جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا لیکن جیسے جیسے وہ خط پڑھتا جارہا تھا اس کے چہرے کا رنگ بھی بدلتا جارہا تھا۔ یہ خط رامو کا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

علی!

"آج ہمارے درمیان جو مقابلہ ہونے والا ہے اس کو میرے ہم مذہب بھائیوں نے غلط رنگ دے کر ایک جذباتی کشمکش کی فضا قائم کر دی ہے مگر میں اس کو عام سا مقابلہ سمجھتا ہوں۔ تم میرے گھریلو حالات سے باخبر ہوگے۔ پتاجی جو

سال بھر پہلے بغیر بتائے کہیں چلے گئے تھے' ان کا خط آیا ہے کہ وہ سو روپے ہمارے خرچ اخراجات کے لئے منی آرڈر کریں گے مگر ان کا منی آرڈر ابھی تک نہیں آیا۔ ہم پر تقریباً سو روپے کا ہی قرض اور سُود چڑھ چکا ہے۔ اگر تم یہ مقابلہ مجھ سے ہار جاؤ تو میرے گھر کے تمام تر مسائل حل ہوسکتے ہیں اور پھر آئندہ بھی قرض وغیرہ ملنے کی امید رکھی جاسکتی ہے! میں یہ خط بہت شرمندگی سے لکھ رہا ہوں مگر میں یہ جانتا ہوں کہ تمہارا مذہب اسلام قربانی کے جذبے' ایثار اور رواداری کو پسند کرتا ہے! اِدھر ایک میں ہوں جو اپنے ہی ہم مذہب لوگوں کے ہاتھوں ذلیل ہو رہا ہوں' امید ہے کہ تم یہ خط نظر انداز نہیں کرو گے۔"

شکریہ

رامو

علی نے خط آہستگی سے میز پر رکھا اور کچھ سوچنے لگا۔

دل نے سرگوشی کی۔ "سوچتے کیا ہو خط پڑھ لیا اب پھاڑ پھینکو۔"

ضمیر سرزنش کے انداز میں بولا۔ "خبردار ایسا نہ کرنا۔"

دل نے کہا۔ "تمہاری چھوٹی بہن بیمار ہے۔ تمہیں بھی ادھار دینا ہے۔ اپنے اور ماں کے لئے کپڑے لینا ہیں اور....."

ضمیر چلایا۔ "غلط مت سوچو علی! وقت تم سے قربانی کا تقاضا کرتا ہے۔"

اور پھر دل اور ضمیر کے درمیان بھی ایک مقابلہ شروع ہوگیا۔ اس کے وجود کے اندر لڑائی جاری تھی۔ دل اور ضمیر کی لڑائی۔ دونوں فتح کی امید پر پُرزور دلائل سے لڑ رہے تھے۔

☆ --- ☆ --- ☆

بنیا رام دیال اور اس کے گرگے رامو کے گھر کا سامان اٹھا اٹھا کر باہر پھینک رہے تھے گلی میں چارپائی پر ایک میت رکھی ہوئی تھی جو رامو کے باپو کی تھی!

رامو کی ماں ایک طرف نڈھال پڑی تھیں آس پاس کئی عورتیں کھڑی تھیں مگر چاہنے کے باوجود رامو کی ماں کی طرف نہیں بڑھ سکتی تھیں کیونکہ رامو علی سے شکست کھانے کے بعد اچھوت سے بھی بدتر ہوگیا تھا۔ یہ ان لوگوں کا متفقہ فیصلہ تھا.....!

گلی میں دور دور تک سرہی سر نظر آرہے تھے اور سب رامو کی بے کسی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اچانک "ٹھہرو" کی زوردار آواز سامنے

سے ابھری۔

رام دیال کے ہاتھ میں ایک دیگچہ تھا جو اس نے زمین پر رکھ دیا۔

سامنے سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا علی آرہا تھا!

سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے تھے!

"ابے او مُسلے! کیا بات ہے؟" رام دیال اس کی طرف بڑھا۔

علی نے ایک نظر رامو کی طرف دیکھا جو اس کو دیکھ کر دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔ رامو کے باپو کی نعش دیکھ کر علی سارا معاملہ سمجھ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر رامو کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "رامو! مجھے افسوس ہے میں تمہارا خط مقابلے سے پہلے نہیں پڑھ سکا تھا۔"

رامو اس کی طرف مڑ کر بولا۔ "علی! منی آرڈر تو نہ آیا میرے پتا جی کی لاش آگئی.....!"

یہ کہتے کہتے اس کا لہجہ بھرا گیا۔

رام دیال چلایا "جلدی کرو باقی سامان بھی باہر لا پھینکو!"

علی ہاتھ اٹھا کر بولا "رام دیال اگر تمہارا مذہب تمہیں کچھ نہیں سکھاتا تو انسانیت ہی کا احترام کرلو۔ کتنے پیسے بنتے ہیں تمہارے؟"

رام دیال طنزیہ لہجے میں بولا "ننانوے روپے بارہ آنے۔ کیا تو دے گا؟"

"یہ لو پورے سو روپے!" علی نے اس کی طرف تھیلی اچھال دی "اور ہاں چار آنے کی مٹھائی لے کر خود بھی کھانا اور ان تماشائیوں کو بھی کھلانا۔"

سب دانتوں میں انگلیاں دبائے علی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لگتا تھا سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ رامو کے آنسو امڈ آئے اور پھر علی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ علی سے لپٹ گیا۔ "تت تم بہت عظیم ہو..... علی۔" اس نے بمشکل کہا۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اور علی کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ ایک اور مقابلہ جیت چکا تھا..... اور جنگ اب بھی حق و باطل کی تھی۔

یوہو مقابلہ نمبر ۴ کے نتائج

پہلا انعام: شیخ ظہیر، کراچی۔ دو ہزار روپے نقد

دوسرا انعام: الیاس مسعود، کراچی۔ ایک ہزار روپے نقد

تیسرا انعام: شاہد امتیاز، لاہور۔ پانچ سو روپے نقد

بھول کر بھی

کامیابی کو دماغ میں اور
ناکامی کو دل میں جگہ نہ دیجیے

یاد رکھیے

کامیابی دماغ میں جگہ پالے تو تکبّر
اور ناکامی دل میں جگہ پالے تو مایوسی
بڑھ جاتی ہے.

مُثبت روّیوں کے ساتھ
مُثبت فِکر کے ساتھ

اپنی شخصیت کی تعمیر کیجیے

دُعاگو آنکھ مچولی

عزم و حوصلہ کی پیکر

ہیلن کیلر

اطہر رضا اجنبی

زندگی ایک آزمائش کا نام ہے، کچھ لوگوں کے لئے یہ آزمائش بہت سہل ہوتی ہے مگر اکثر لوگوں کے لئے یہ نہایت دشوار اور کٹھن ثابت ہوتی ہے۔ خصوصاً" ان کے لئے جو اس دنیا میں آنے کے بعد معذوری کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے اس دنیا میں اندھیروں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مگر ان سے بھی زیادہ بدنصیب وہ ہوتے ہیں جو زندگی کے ابتدائی سالوں میں تو دنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں مگر پھر کوئی حادثہ ایسا ہوجاتا ہے جو انہیں دلکش نظاروں اور خوبصورت آوازوں سے محروم کردیتا ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ اس بدنصیبی سے گزرے ہیں۔ کچھ تو ہمت ہار بیٹھے مگر بعض اپنی زندگی کے اندھیروں میں محنت، لگن اور جہد مسلسل کے باعث اجالے کرنے میں کامیاب ہوگئے، یہ اجالے علم کے تھے جنہوں نے ان

لوگوں کی زندگیوں کو آنے والوں کے لئے نمونہ بنادیا۔ یہ تمام لوگ وہ تھے جنھوں نے زندگی کی آزمائش کا ڈٹ کر اور ہمت سے مقابلہ کیا اور آنے والے وقت نے انہیں اس مقابلے میں فاتح قرار دے دیا۔ زندگی کی مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کرکے ان پر فتح پانے والے لوگوں میں ایک عظیم نام "ہیلن کیلر" کا ہے۔

مارک ٹیون نے ایک بار کہا تھا۔ "انیسویں صدی کی دو دلچسپ شخصیات نپولین اور ہیلن کیلر ہیں۔" اس نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب ہیلن صرف پندرہ سال کی تھی۔ لیکن اٹھاسی سال کی بھرپور عمر گزارنے والی یہ عورت تاریخ کے صفحات میں بیسویں صدی کی بھی عظیم شخصیتوں میں سے ایک ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں الباما کے قصبے میں سنہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہونے والی یہ بچی انیس ماہ کی عمر تک ایک نارمل بچی تھی، وہ نہ صرف یہ کہ چیزوں کو دیکھ سکتی تھی بلکہ اردگرد کی آوازیں بھی سن سکتی تھی۔ مگر فروری سنہ ۱۸۸۲ء میں جب ہیلن کی عمر صرف انیس ماہ تھی، وہ ایک مصیبت میں گرفتار ہوگئی۔ اسے مہلک بخار نے آلیا۔ اس بخار نے معصوم بچی سے اس کی سماعت اور بینائی چھین لی۔ فوراً بعد پتہ چلا کہ وہ گونگی بھی ہوگئی ہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انیس مہینے کی اس ننھی سی بچی کے لئے کیسا اذیت ناک مرحلہ تھا جو نہ سن سکتی تھی، نہ بول سکتی تھی اور نہ دیکھ سکتی تھی۔ اور یہ روگ، ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق ساری عمر کا تھا۔

ہیلن کی تاریک زندگی میں روشنی کی پہلی کرن مس سیلی وان تھی۔ مس سیلی وان خود بچپن میں نابینا ہوگئی تھی۔ مگر قدرت نے اسے دوبارہ بصارت عطا کردی تھی۔ وہ نابیناؤں کا درد سمجھتی تھی اور دوبارہ بینائی ملنے کی شکر گزاری کے طور پر نابیناؤں کے کام آنا اپنا فرض سمجھتی اور اس پر خدا کا شکر ادا کرتی تھی۔

ہیلن کی تربیت سخت مشکل کام تھا کیونکہ مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ وہ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ بلکہ اصل مشکل یہ تھی کہ وہ نہ تو بول سکتی تھی اور نہ ہی سن سکتی تھی۔ لیکن مس سیلی وان ایک دھن کی پکی خاتون تھی۔ رفتہ رفتہ وہ ہیلن کی زبان اور آنکھ بن گئی۔ اس نے تربیت کا انوکھا انداز اپنایا۔ ایک دن وہ اسے دریا کے کنارے لے گئی۔ اس نے ہیلن کا ہاتھ پکڑا اور دریا کے پانی میں ڈال دیا پھر باہر نکال کر ریت پر انگریزی میں (Water) لکھا۔ یہ عمل اس نے کئی بار دہرایا۔ جلد ہی ہیلن سمجھ گئی کہ

(Water) کیا ہے اور کیسے لکھا جاتا ہے۔ ہیلن کی اس چھوٹی سی کامیابی سے مس سیلی وان بہت خوشی ہوئی۔اس کامیابی سے ہیلن کے مستقبل میں مزید کامیابیوں کے دروازے کھلتے ہوئے مس سیلی وان کو صاف نظر آرہے تھے۔اور ننھی ہیلن کی خوشی کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔بلاشبہ یہ مس سیلی وان کا بہت عظیم کام تھا کہ صرف ایک ماہ کے مختصر عرصہ میں وہ ایک ایسی بچی کے ساتھ خیالات کا تبادلہ کرنے میں کامیاب ہوگئی جو مکمل تاریکی اور خاموشی کی دنیا میں گم تھی۔ ہیلن نے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے اپنی کتاب "میری داستانِ حیات" میں لکھا ہے کہ"اس روز شاید دنیا میں کوئی بچہ مجھ سے زیادہ مسرور نہیں تھا۔ جب وہ سنہری دن ڈھلنے پر میں اپنے بستر میں گئی تو ان خوشیوں کا تصور کررہی تھی جو وہ دن میرے لئے لایا تھا۔اور زندگی میں پہلی بار مجھے اگلے دن کا شدت سے انتظار تھا۔"

جب ہیلن کی عمر آٹھ سال ہوئی تو اسے نابیناؤں کے ایک اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ وہ اگرچہ یہ بھول چکی تھی کہ کس طرح بولا جاتا ہے مگر اس کے اساتذہ اس کی مدد کررہے تھے۔ اس کی ٹیچر ہیلن کے ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھتی اور اسے سمجھاتی کہ بولتے وقت ہونٹ کس طرح جنبش کرتے ہیں۔ ہیلن نے اس قسم کی بہت سی آزمائشیں کیں اور پھر ایک دن ایسا آیا جب وہ دوبارہ بولنے کے قابل ہوگئی۔ خوشی اس سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔"واہ کیا لطف ہے۔" یہ وہ مختصر اور کیفیات سے پُر جملہ تھا جو ہیلن نے اپنے جذبات کے اظہار کے طور پر ادا کیا۔ اب رفتہ رفتہ وہ بریل سسٹم کے تحت کتابیں پڑھنے لگی اور جلد ہی وہ اس قابل ہوگئی کہ جس طرح دوسرے لوگ مطالعہ کرتے ہیں ویسے ہی وہ بھی کرے۔ پھر وہ وقت بھی آگیا جب باآسانی اپنے تمام امتحانات پاس کرنے کے بعد ہیلن نے پہلے کالج اور پھر ہارورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ یہ تاریخ انسانی کا ایک حیرت انگیز واقعہ تھا۔

ہارورڈ یونیورسٹی میں دورانِ تعلیم ہیلن کیلر نے خود کو دوسرے نارمل طلباء و طالبات سے زیادہ بہتر ثابت کیا اور بغیر کسی مشکل کے گریجویشن کرلیا۔ علم جیسی نعمت سے آشنا ہونے کے بعد اس باحوصلہ خاتون نے یہ بیڑا اٹھالیا کہ نابیناؤں کی مدد کے لئے ملکوں ملکوں سفر کرے گی اور وہاں کی حکومتوں کو ان کی مدد کے لئے اکسائے گی۔ اس نے تقریباً" ساری دنیا کا سفر کیا اور ہر ملک میں نابیناؤں کے ادارے قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں جب کہ ہیلن

کی عمر ۷۶ برس تھی، وہ وطن عزیز پاکستان میں بھی آئی اس کا یہ دورہ یہاں کے نابیناؤں اور بہروں کی امداد کے لئے تھا۔ یہاں اس نے کئی جگہوں پر خطاب کیا۔ کراچی کے "اسکول برائے نابینا، گونگے اور بہرے طلباء" میں خطاب کرتے ہوئے ہیلن نے کہا۔

"کیسا اچھا اسکول ہے! اپنے آپ کو آپ لوگوں کے ساتھ پاکر مجھے بہت خوشی محسوس ہورہی ہے۔ میرے عزیز بیٹو اور بیٹیو! ہمیشہ خوش و خرم رہنا سیکھو اور کبھی اپنی قسمت کو مت کوسنا کہ تم اس دنیا میں ہر کام کرسکتے ہو۔"

ہیلن کیلر کا یہ خطاب ریکارڈ میں موجود ہے اور اس کا آخری جملہ نہ صرف معذوروں کے لئے بلکہ ہم نارمل انسانوں کے لئے بھی ایک بہترین پیغام ہے اور اس کا عملی نمونہ خود ہیلن کی اپنی زندگی ہے۔

نامساعد حالات میں زندگی گزارنے کے باوجود اپنی زندگی کو محنت اور لگن کے ذریعے نمونہ بنادینے والی اس باہمت خاتون کا انتقال سنہ ۱۹۶۸ء میں اٹھاسی برس کی عمر میں ہوا۔ بچپن میں بولنے کی صلاحیت سے محروم ہوجانے والی یہ خاتون اپنی آخری عمر کو پہنچتے پہنچتے انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور دیگر کئی زبانوں پر دسترس حاصل کرچکی تھی۔ تاریخ اور جغرافیہ میں اس کی استعداد قابلِ رشک تھی۔ نابینا ہونے کے باوجود اس نے اتنی کتابیں پڑھی تھیں جتنی بہت سے آنکھوں والے نہیں پڑھتے۔ وہ خود سات کتابوں کی مصنفہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے بارے میں ایک فلم بھی بنائی تھی اور اس میں خود کام بھی کیا تھا۔ معذور ہونے کے باوجود اس نے اپنی دیگر صلاحیتوں کو قابلِ رشک ترقی دی تھی۔ وہ دوسرے کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر یہ جان سکتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ دوسری بار مصافحہ کرکے وہ یہ جان سکتی تھی کہ ہاتھ ملانے والا شخص غمگین ہے یا خوش۔ چاہے پہلے مصافحہ کو پانچ برس کا عرصہ ہی کیوں نہ گزر گیا ہو۔

زندگی اور اس کے مسائل سے مقابلے کی تاریخ میں ہیلن کیلر کی ذات مثال ہے ان لوگوں کے لئے جن سے زندگی کی نعمتیں چھن جاتی ہیں کہ ہیلن نے کچھ نہ ہوتے ہوئے بہت کچھ کیا اور اس کی زندگی آئینہ ہے ان لوگوں کے لئے جن کے پاس سب کچھ ہوتا ہے اور وہ کچھ نہیں کرتے۔

مقابلوں کے درمیاں

الطاف حسین

مرے وطن کا ہر جواں! ہے ہمتوں کا ترجماں!
مقابلوں کے درمیاں نشان فتح ہے عیاں
مرے وطن کا ہر جواں!

وہ ظلمتوں کے دور میں وہ وحشتوں کے شور میں
وہ دہشتوں کے جور میں ہے چاہتوں کا نکتہ داں
مرے وطن کا ہر جواں!

جو نفرتوں کو کم کرے جو دشمنوں کو خم کرے
جو ختم ہر ستم کرے وہ جرأتوں کا ہے نشاں
مرے وطن کا ہر جواں!

وہ علم کی ہے نہر بھی جفا کشی کا شہر بھی
عدو کے حق میں قہر بھی ہے تیز دھار اک سناں
مرے وطن کا ہر جواں!

وفا ہی جس کا کام ہے خلوص جس کا عام ہے
مرا اسے سلام ہے وطن کا ہے وہ پاسباں
مرے وطن کا ہر جواں!

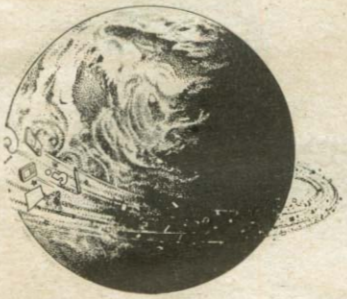

قصہ کوئز

سلیم مغل

اس بار قصہ کوئیز کے لئے ایسے واقعات اور شخصیات کا انتخاب لیا گیا ہے جنہیں مقابلہ سے کوئی نہ کوئی نسبت ہے۔ ہر واقعہ اپنی جگہ دلچسپ، معلوماتی اور تحریک عطا کرنے والا ہے۔ آپ ان قصوں کو بہ غور پڑھئے اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات ۱۵ یوم کے اندر آنکھ مچولی کے پتے پر بھجوا دیجئے۔ درست جوابات پر ہم نہ صرف آپ کی علمیت کے قائل ہو جائیں گے۔ بلکہ آپ میں سے تین ساتھیوں کو بہترین انعام بھی بھجوائیں گے۔ بقیہ کامیاب شرکاء کے نام مبارک باد کے ساتھ شائع کئے جائیں گے۔ لیجئے مقابلہ حاضر ہے (مرتب)

۱۔ ۱۱۷ عیسوی کا واقعہ ہے جب اس نے افریقہ میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے بعد اس آبنائے کو عبور کرنے کا فیصلہ کیا جو افریقہ اور یورپ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ عربوں اور بربروں پر مشتمل بہادر سپاہیوں کی ناقابل تسخیر فوج تھی۔ اس کا ہدف سمندر کے اس پار کا علاقہ تھا۔ سمندر کی تند و تیز موجوں سے لڑتے ہوئے آخر کار آبنائے کو کامیابی سے عبور کر لیا گیا۔ اس سے قبل کہ وہ فوج کی صفوں کو ترتیب دیتا اور لشکر کشی کرتا اس نے محسوس کیا کہ اس کی فوج کے بعض افسران اس مہم کو خطرناک اور ناقابل فتح سمجھ رہے ہیں۔ لہٰذا اس نے ایک عجیب و غریب حکمت عملی اختیار کی اور اپنی تمام کشتیوں کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک سحر انگیز تقریر کی جس نے پوری فوج کے جذبوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیا۔ اس نے کہا۔ "یاد رکھو! تمہارے سامنے دشمن ہے اور تمہارے عقب میں سمندر، تمہارے سامنے بھی موت ہے اور پیچھے بھی موت، تو پھر کیوں نہ ہم آگے بڑھ کر اس دلیری سے لڑیں کہ دشمن بھاگ کھڑا ہو۔ یاد

رکھو! یہ پوری زمین اللہ کی ہے اِسی لئے میں یہ کہتا ہوں کہ زمین کا ہر خطہ ہمارا خطہ ہے۔" اس کے بعد پوری فوج نے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ مسلمان غالب ہوئے اور دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔

(الف) بتایئے ہم نے کس فاتح جرنیل کا ذکر کیا؟

(ب) مسلمانوں نے یورپ کا کون سا شہر فتح کیا؟

●●

۲۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں انگلستان میں، "جوہن بل ورلڈ ریسلنگ چمپئن شپ" کا آغاز ہوا۔ ۲۸ سالہ ہندوستانی پہلوان بھی اس چمپئن شپ میں شریک ہونے کے لئے پہنچا مگر اس کے چھوٹے جسم کے باعث اسے مقابلے کے لئے غیر موزوں قرار دے کر چمپئن شپ سے خارج کر دیا گیا۔ جیوری کی رائے اسے اپنے لئے ذلت اور رسوائی کا فیصلہ محسوس ہوئی اِس نے اعلان کر دیا کہ جو پہلوان بھی اس کے سامنے مسلسل پانچ منٹ تک ٹک کر دکھائے گا وہ اسے تین پاؤنڈ بطور انعام دے گا۔ پھر یکے بعد دیگرے تین پہلوان آئے اور باری باری چت ہوتے رہے۔ پھر اس چمپئن شپ کے ۱۲ مشہور پہلوان اکھاڑے میں اترے مگر کوئی بھی دو یا تین منٹ سے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا۔ اس واقعہ کے بعد اس کے نام کا شہرہ چار سو پھیل گیا، مجبوراً" جیوری کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ اس چمپئن شپ میں اس کی سب سے مشہور کشتی پولینڈ کے مشہور پہلوان "زبسکو" سے ہوئی اِس نے چند سیکنڈ میں "زبسکو" کو زمین پر دے مارا مگر اس کشتی کا فیصلہ نہ ہو سکا لہٰذا کشتی کا ایک اور دن رکھا گیا۔ اس روز پولینڈ کا پہلوان بھاگ لیا اور مقابل نہ آیا۔ اس طرح "جوہن بل بیلٹ" ہندوستانی پہلوان نے جیت لی اس نے تیس سال سے زیادہ عرصے تک اکھاڑے پر اپنی اجارہ داری قائم رکھی ایک ہزار سے زائد پہلوانوں سے کشتیاں لڑیں اور کبھی شکست نہ کھائی۔

(الف) اس ناقابل شکست پہلوان کے اصل اور معروف دونوں نام بتایئے۔

(ب) ان کا تعلق ہندوستان کے کس علاقے سے تھا۔

●●

۳۔ پاکستان کو قائم ہوئے ابھی سال بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ کشمیر میں بھارتی فوج کے ایک دستے نے فوجی اہمیت کی ایک پہاڑی پر قبضہ کر لیا۔ پاکستانی فوج کی پنجاب رجمنٹ کو پہاڑی واپس لینے کا

مشکل ٹاسک ملا۔ پنجاب رجمنٹ کی جس کمپنی کو پہاڑی کا قبضہ واپس لینے کے لئے بھیجا گیا' یہ نوجوان اس کمپنی کا کمانڈر تھا۔ ۲۷ جولائی سنہ ۱۹۴۸ء کو وہ اپنی کمپنی کے جوانوں سمیت آگے بڑھا۔ نصف شب گزر جانے کے بعد سخت اندھیرے اور دشوار راستوں کی تکلیف کے باوجود وہ آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ دشمن کے مورچوں سے بہ مشکل تمام پچاس گز کے فاصلے پر جا پہنچا۔ کسی آہٹ سے دشمن بیدار ہو گیا اور اس نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ فائرنگ کے باوجود آگے بڑھنے کا سفر جاری رہا۔ اس کا بازو گولی لگنے سے سخت زخمی ہوا مگر اس نے اس کی پرواہ نہ کی۔

خاردار تاروں کی رکاوٹ کو توڑتا ہوا وہ اپنے چھ ساتھیوں سمیت آگے بڑھ گیا۔ دشمن کی گولیوں نے اسے لہو میں نہلا دیا اور آخر کار وہ شہید ہو گیا۔ لیکن آخری سانس تک آگے بڑھنے کا سفر جاری رہا۔

ان کی شہادت کے بعد ان کے جاں نثار ساتھیوں نے دلیری اور شجاعت کا وہ مظاہرہ کیا کہ دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔ پہاڑی واپس لے لی گئی۔ کمانڈر شہید کو بعد از شہادت ملک کا سب سے بڑا فوجی اعزاز عطا کیا گیا۔

(الف) ہم کس بہادر' جواں مرد شہید کا ذکر کر رہے ہیں؟

(ب) انہیں شجاعت کا کون سا تمغہ اور ترتیب میں کس نمبر پر دیا گیا؟

●●

۴۔ سلطنت آسٹریلیا و ہنگری کا فرمانروا آرچ ڈیوک فرڈی نینڈ' صوبہ بوسنیا کے دارالحکومت سرائیوو کی ایک سڑک پر اپنی گاڑی میں بیٹھا ہوا کہیں جا رہا تھا۔ اسی اثناء میں ایک سرپھرے سے سربیائی آزادی پسند نوجوان نے تاک کر ایک فائر کیا اور فرمانروا اسی لمحے جاں بحق ہو گیا۔ یہ ایک موت کتنی قیمتی جانوں کے زیاں کا باعث بنتی چلی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملک سے ملک جنگ کی آگ پھیلتی چلی گئی۔ اس جنگ میں ایک کروڑ سے سے زیادہ ہلاکتیں ہوئیں جبکہ دو کروڑ سے زیادہ انسان ناکارہ ہوئے۔

●●

(الف) کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس واقعے کے نتیجے میں کون سی جنگ کا آغاز ہوا؟

(ب) اس جنگ میں فاتح کون تھا؟ اور مفتوح کون؟

۵۔ دشمن کا لشکر بہت زیادہ تھا اور لشکر بھی ایسا کہ پہلی رَو سدھائے ہوئے جنگی ہاتھیوں کی تھی جن کا مقابلہ آسان نہ تھا۔ اس کمانڈر کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کی فوج قلیل ہے اور مقابلہ سخت۔ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد جنگ کی حکمت عملی وضع کی اور جنگ کو اندھیرا ہونے تک روکے رکھا۔ اندھیرے کی سیاہی چاروں طرف پھیل گئی تو اس نے ایک عجیب و غریب کام کیا بہت سے بیلوں کو جمع کیا اور ان کے سینگوں پر کپڑوں کے گٹھے اور گھاس پھونس باندھ کر ان پر آگ لگادی۔ آگ کے شعلے بھڑکے تو بیلوں کو دشمن کے لشکر کی طرف ہنکادیا۔ سینگوں پر بھڑکتے شعلے لئے ہوئے جب بیل دشمن کی طرف بھاگے تو دشمن بوکھلا گیا۔ رات کے اندھیرے میں بڑی بڑی مشعلیں لئے یہ کوئی پوری قوت سے بھاگا چلا آرہا تھا! انگریز دشمن تو ششدر تھا ہی خود اس کی لشکر کے ہاتھی بھی بوکھلا گئے اور ایسے حواس باختہ ہوئے کہ پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے ہی سپاہیوں کو کچل دیا۔ بیلوں کے دماغ جب آگ کی شدت سے جلنے لگے تو وہ بھی پاگل ہوگئے اور دشمن کے لشکر میں ایسے آگے پیچھے ہوئے کہ دشمن تتر بتر ہوگیا۔ ساری صف بندی ختم ہوگئی۔

یوں ایک ذہین کمانڈر نے گوریلا جنگ کا حربہ آزما کر دشمن پر قابو پالیا۔

(الف) اس عسکری لیڈر اور بہادر کمانڈر کا نام بتایئے؟

(ب) اس حکمران اور جرنیل کا بیٹا بھی حریت پسند مجاہد تھا۔ اس کا نام بھی بتایئے؟

قصہ کوئیز (ماہ دسمبر ۹۶ء) کے درست جوابات

۱۔ (الف) سلطان التتمش (ب) حضرت بختیار کاکیؒ

۲۔ (الف) ایکسرے۔ (ب) روتنجن۔

۳۔ (الف) سدھارتھ (گوتم بدھ) (ب) بھارت کے صوبہ بہار کا شہر گیا۔

۴۔ (الف) سید ببر علی انیس۔ (ب)

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

(یا کوئی بھی شعر)

۵۔ (الف) قطب الدین ایبک۔ (ب) سمرقند

گزشتہ مقابلے میں صرف ۴ جوابات (مکمل درست) موصول ہوئے۔ لہٰذا چاروں شرکاء کو انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔

۱۔ سعیدہ حسین، علامہ اقبال کالونی، لاہور
۲۔ ایلا نذیر، منڈی مرید کے
۳۔ وقاص ایوب، شاہدرہ ٹاؤن، لاہور
۴۔ محمد اطہر، بورے والا

نومبر ۹۶ء انعام کا قرعہ ان کے نام نکلا۔

۱۔ صفیہ زبیر، اسلام آباد
۲۔ جاذب رضا بخاری، ڈیرہ اسماعیل خان۔
۳۔ شباب زہرہ، کراچی

(نومبر ۹۶ء) تمام جواب درست دیئے۔

۱۔ آمنہ جعفری، راولپنڈی
۲۔ خرم شیرازی، بھکر
۳۔ نبیلہ کرن، منڈی مرید کے
۴۔ عامر جلیل، بھکر

یہ حقیقت ہے ——— زاہد اقبال ذوالفقاری، شکردرہ

۱۔ سانپ زبان سے راستہ تلاش کرتا ہے۔
۲۔ ہاتھی کے بعد دنیا کا سب سے بڑا جانور گینڈا ہے۔
۳۔ ایک چڑیا ایک دن میں ایک چھٹانک دانہ کھا سکتی ہے۔
۴۔ کیکڑے کے دانت اس کے پیٹ میں ہوتے ہیں۔
۵۔ کٹل فش ایک ایسا جانور ہے جس کے تین دل ہوتے ہیں۔
۶۔ چین میں کوئی چڑیا گھر نہیں ہے۔
۷۔ سب سے زیادہ وٹامن سی سنگترے میں پایا جاتا ہے۔
۸۔ چمگادڑ پرندہ نہیں ہے، کیونکہ اس کے پر نہیں ہوتے۔

پتھر کا سِل بٹّا ہے ؟
کیسا چپٹا بٹّا ہے ؟

مسجد کا مینارہ ۔ پتھر کا غبارہ ؟
مٹی کا کھلونا ۔ یا کوئی امرت دھارا ؟

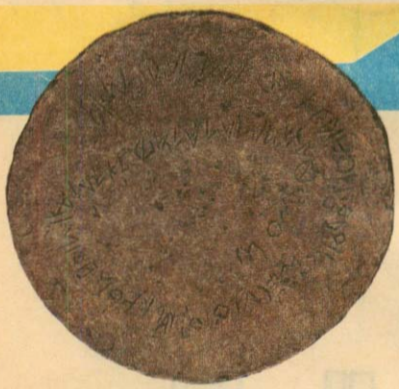

لوہے کی تھالی
کھیلوں کی دنیا میں
کتنی مثالی ؟

بھوت پریت چڑیل ہے یہ ؟
یا کوئی ہاتھی بیل ہے یہ ؟
غور کرو اور بتلاؤ ؟
کیسا جھیل جھمیل ہے یہ ؟

مقابلہ نمبر 1

درست جوابات ۱۵ روز کے اندر بھجوادیں
جواب علیحدہ کاغذ پر ۔ مکمل نام پتے کے ساتھ ارسال کریں

آنکھ مچولی مقابلہ سوجھ بوجھ

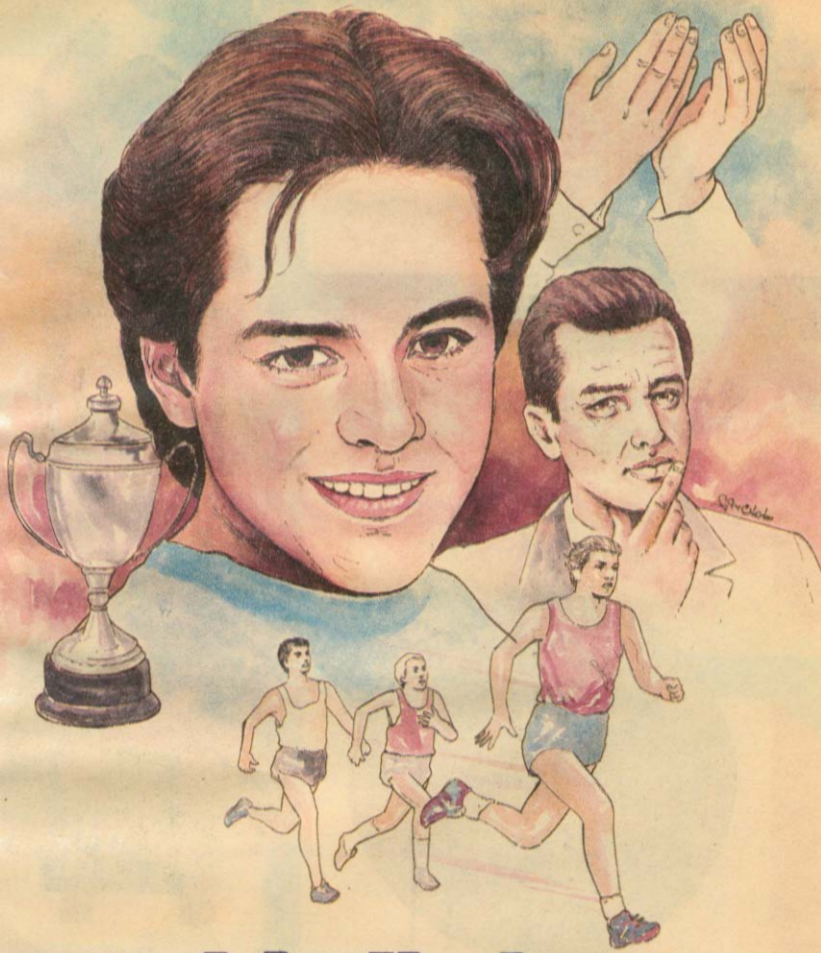

کامیابی کا راز

کامیابی کا تعلق عمل اور دُعا سے اتنا گہرا بھی ہو سکتا ہے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ایک ایسے مُقابلے کی رُوداد جس نے ارسلان کے والد کی زندگی بدل دی، یہی نہیں خود اُس کی اپنی زندگی میں بھی خوشگوار تبدیلی آگئی ——— یہ خوبصورت کہانی بھیجی ہے "طاہر ناز انصاری" نے ضلع جہلم کے شہر دینہ سے ارسال کی ہے۔

اسکول میں سالانہ کھیلوں کے مقابلے شروع ہو چکے تھے ..... کل دوڑ کا مقابلہ ہونا تھا ذیشان اس مقابلے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ وہ تین سال سے اپنے اسکول کا چمپئن چلا آرہا تھا۔ لیکن اس مرتبہ ارسلان بھی پوری تیاری میں تھا۔ ویسے تو ارسلان ذیشان سے پیچھے ہی رہتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ ارسلان کو امید تھی کہ وہ اس سال کا چمپئن بنے گا اور ٹرافی اس کا مقدر بنے گی ..... چونکہ دونوں کی تیاری بھرپور تھی اس لئے توقع کی جارہی تھی کہ اس بار مقابلہ سخت ہوگا۔

ذیشان نے ارسلان کو دیکھا تو اترا کر کہنے لگا۔ "دیکھ لینا کل پھر ٹرافی حاصل کر کے سال بھر کے لئے پھر سے چمپئن بنوں گا۔"

"لیکن یہ مت بھولو کہ اس مرتبہ میں بھی فل تیاری میں ہوں اور انشاء اللہ یہ مقابلہ میں ضرور جیتوں گا۔" ارسلان نے کہا۔

ذیشان یہ سنتے ہی کھلکھلا کر ہنس دیا اور طنزیہ انداز میں کہنے لگا۔ "اس سے پہلے بھی کبھی مقابلہ جیتا ہے جو اس بار جیت جاؤ گے؟"

"ہاں جیت جاؤں گا۔" ارسلان نے اعتماد اور قدرے غصے سے جواب دیا۔ "میں نے صرف تیاری ہی نہیں کی، اپنی کامیابی کے لئے دعائیں بھی کی ہیں۔ میرے والدین بھی میرے لئے دعائیں کر رہے ہیں دیکھ لینا مقابلہ میں ہی جیتوں گا۔"

"ارے رشوت خوروں کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ بچو پہلے ابا سے کہو رشوت لینا چھوڑ دیں پھر دعائیں کریں۔"

ذیشان کی اس بات پر قریب کھڑے ہوئے لڑکوں کی ٹولیاں قہقہے لگانے لگیں اور یہ قہقہے جیسے زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے جو ارسلان کے سینے میں پیوست ہو رہے تھے۔ وہ بری طرح سٹپٹا گیا

"حرام کی کمائی پر پلنے والوں کی اللہ کیوں سنے گا، ارسلان میاں" یہ گویا ذیشان کی طرف سے دوسرا حملہ تھا۔ یہ جملہ ارسلان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ جواباً اس نے بھی کھری کھری سنادیں۔ یوں گویا جملے بازی سے بڑھتے بڑھتے نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ سائنس کے استاد، سر امتیاز فوراً وہاں آگئے اور ان کی مداخلت سے بات آئی گئی ہوگئی۔ ورنہ آج کے اس دنگے میں کسی ایک کا سر ضرور کھل جانا تھا۔

جھگڑا کہنے کو ختم ہوگیا لیکن ارسلان کو بری طرح گھائل کر گیا۔ "رشوت خوروں کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔" "حرام خوروں کی دعائیں اللہ کیوں سنے گا" یہ جملے بار بار اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ غصے سے کبھی وہ مٹھیاں بھینچتا تو

کبھی دانت پیسنے لگتا کیا واقعی ابو رشوت لیتے ہیں۔

کیا واقعی رشوت کی کمائی کھانے والوں کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں؟..... یہ سوچتے ہوئے ارسلان کے ذہن میں وہ خوبصورت طوطا آگیا جو پچھلے سال بیمار ہوکر مرگیا تھا۔ اس نے اس کی صحت یابی کی کتنی دعائیں مانگی تھیں مگر اس کا طوطا ٹھیک نہیں ہوا تھا..... اسی طرح کی باتیں سوچتے سوچتے ارسلان گھر پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے ارسلان آج تم اتنے افسردہ کیوں ہو؟"

"کیا ماسٹر صاحب نے کچھ کہا ہے؟" ارسلان کی امی نے اسے پریشان دیکھ کر پوچھا "امی، کچھ نہیں ہے مجھے بس یونہی کچھ تھک گیا ہوں۔" اس نے گویا اپنی اندر کی کیفیت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

وہ دن اس نے بڑے کرب میں گزارا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ وہ کھیل کے مقابلے سے دستبردار ہوجائے مگر پھر ارادہ بدل لیا کہ کہیں ایسا کرنے سے ذیشان اور اسکول کے دوسرے لڑکوں کو مذاق اڑانے کا ایک اور موقع ہاتھ نہ آجائے۔

دوسرے روز ریس ڈیک پر پوری طرح مستعد اور تیار کھڑے ہوئے ایک بار پھر وہی جملے اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔ "رشوت خوروں کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں" "حرام خوروں کی اللہ کیوں سنے گا۔" اس کا جی چاہا کہ وہ ریس شروع ہونے سے قبل بھاگ کر کہیں اور چلا جائے لیکن پھر اس نے ذہن کو جھٹک دیا' اپنے خیالات کو یکسو کیا اور اپنے اللہ سے اپنی کامیابی کی دعا کرنے لگا۔

چند لمحوں بعد ریس کا آغاز ہوچکا تھا۔ ۸۰۰ میٹر کی ریس میں یوں تو اور بھی لڑکے شریک تھے مگر اصل مقابلہ ارسلان اور ذیشان کے مابین تھا۔ اس مقابلے میں کبھی ارسلان اور کبھی ذیشان ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے اسٹیڈیم کے چاروں طرف موجود طلباء کی بڑی تعداد بھی اس مقابلے سے محظوظ ہورہی تھی۔ تالیاں بج رہی تھیں' شور ہورہا تھا کچھ منچلے لڑکے سیٹیاں بجا بجا کر اپنے جذبات کا اظہار کررہے تھے۔

مقابلے کے آخری راؤنڈ میں دونوں نے پوری رفتار سے دوڑنا شروع کردیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کون کس سے آگے ہے؟ بھاگتے بھاگتے ارسلان نے ایک نظر ذیشان پر ڈالی تو اسے ایسا لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ بھلا "رشوت

خور کا بیٹا کیسے جیتے گا اور یہ کہ حرام خور کی دعا کیسے قبول ہوگی۔"

ارسلان کے قدم لڑکھڑائے..... اور اگلے ہی لمحے ذیشان نے فنش لائین عبور کرلی۔ اس بار بھی مقابلہ ذیشان نے جیت لیا۔ اسٹیڈیم تالیوں سے گونج اٹھا۔ یہ ارسلان کی مسلسل چوتھی شکست تھی۔ یوں تو وہ ہار ماننے والا کب تھا مگر اس بار وہ واقعی بجھ سا گیا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ اس کے ابا رشوت لیتے ہیں اور یہ کہ رشوت لینے والوں کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ ارسلان اس مقابلے میں دوسرے نمبر پر آیا تھا مگر اسے اس کی خوشی بالکل بھی نہ تھی۔ اس کا مقابلہ تو ذیشان سے تھا اور وہ یہ مقابلہ ہار چکا تھا۔

وکٹری اسٹینڈ پر ذیشان سے کچھ نیچے دوسری پوزیشن پر کھڑے ہوئے اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ وہ وکٹری اسٹینڈ پر کھڑا ہے۔ وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ "ابا تو گریڈ ۱۷ کے ملازم ہیں۔ پھر یہ گھر میں پیسے کی ریل پیل کیسی ہے؟ ان کے پاس اتنی اچھی کار کہاں سے آئی۔ جہاز میں سفر کرنے کے لئے وہ پیسے کہاں سے لاتے ہیں؟ یہ اور ایسے بہت سے خیالات اسے اس کے اندر سے توڑ پھوڑ رہے تھے۔ اسے یقین سا ہوگیا تھا کہ وہ ایک رشوت خور کا بیٹا ہے۔ ایک ایسے رشوت خور کا بیٹا جس کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ وہ سوچتا رہا، جلتا رہا، کڑھتا رہا اور دو آنسو اس کی آنکھوں سے رخسار پر بہہ نکلے۔

جب وہ گھر آیا تو سب کے سب نے بے تابی سے پوچھا۔ "مقابلہ کیسا رہا؟" اس کے جواب میں وہ رو دیا اور خوب رویا۔ اپنے بچے کی یہ حالت دیکھ کر ماں سے برداشت نہ ہوا اور اس نے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔ "کیا ہوا میرے لعل کو۔ کیوں دل چھوٹا کرتے ہو۔ مقابلے میں ہار جیت تو ہوتی ہے بیٹا۔" ماں نے اس کا دل رکھنے کی کوشش کی مگر بات ہار جیت کی نہیں تھی بات تو رشوت کی تھی اور بات تو دعاؤں کے قبول نہ ہونے کی تھی۔

ابو نے بھی ارسلان کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر وہ مسلسل رو رہا تھا اور روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ آخر کار وہ پھٹ پڑا۔ اور اس نے پہلی بار ابو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ ہی لیا۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کہیں آپ رشوت تو نہیں لیتے؟"

ارسلان نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے ابو نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر دے مارا۔

"بدتمیز..... یہ بات تم اپنے باپ سے پوچھ رہے

ہو؟ گستاخ....."

"سب کہتے ہیں..... اسکول میں ذیشان اور دوسرے لڑکے بھی کہہ رہے تھے کہ تمہارے ابو رشوت لیتے ہیں۔" ارسلان نے روتے ہوئے مگر تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ اس کے ابو کا منہ حیرت اور غصے سے کھلا ہوا تھا اور وہ بولے جارہا تھا "جو لوگ رشوت کے پیسوں کا کھانا کھاتے ہیں وہ کھانا برا ہوتا ہے اور رشوت لینے والوں کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں۔ اسی لئے میری دعا قبول نہیں ہوئی تھی اور میرا پیارا طوطا مرگیا تھا..... اگر میں بیمار ہوجاؤں تو میں بھی مرجاؤں گا۔ کیونکہ آپ کی دعا قبول نہیں ہوگی۔"

اس کے ابو اسے دیکھے جارہے تھے۔ غصے اور جذبات سے ان کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھے اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ ارسلان ابھی تک سسکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔ اس کی امی نے اسے بڑی مشکلوں سے چپ کرایا اور جیسے تیسے کچھ لقمے کھلانے میں کامیاب ہوسکیں۔ دل گیر اور دل گرفتہ ارسلان روتے روتے سوگیا۔

وقت گزرتا گیا اور یہ بات بھی آہستہ آہستہ ماضی کا حصہ بن گئی۔ ارسلان ایک بار پھر اسکول کی پڑھائی اور دوسرے معمولات میں مصروف ہوگیا۔

☆ --- ☆ --- ☆

سال کیسے گزر گیا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ اسکول میں ایک بار پھر مقابلوں کی باتیں اور مقابلوں کے تذکرے شروع ہوگئے۔ ٹیموں کے نام لکھے جانے لگے، مقابلوں کے شیڈول ترتیب دیئے جانے لگے اور پھر وہ دن آگیا جب ایک بار پھر ریس ٹریک پر ذیشان اور ارسلان قریب قریب کھڑے ہوئے مقابلہ شروع ہونے کے منتظر تھے۔

اس بار ارسلان مقابلے میں ہرگز شریک نہ ہوتا اگر اس کے والد نے اسے سختی سے حکم نہ دیا ہوتا۔ "اس بار اس کے ابو اس کے مقابلے میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟ کیا وہ رشوت لینا چھوڑ چکے ہیں۔ کیا انہوں نے اپنی روش بدل لی ہے۔" اس کے چہرے پر اطمینان کی سی کیفیت کا رنگ ابھرا۔ اس نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کرتے ہوئے رب سے دعا مانگی اور اگلے ہی لمحے ریس کا آغاز ہوگیا۔ لمبی ریس ہمیشہ آہستہ شروع ہوتی ہے مگر اس کے آخری لمحوں میں تمام کھلاڑی پوری قوت سے دوڑتے ہیں۔ ریس شروع ہوئی تو اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کون جیتے گا؟ مگر جوں جوں ریس آخری راؤنڈ کی

طرف بڑھنے لگی صورتحال واضح ہوتی چلی گئی۔ ارسلان اس ریس میں سب سے آگے تھا۔ اتنا آگے کہ کوئی اس کی ہوا کو بھی نہیں چھو سکتا تھا۔ آج ارسلان کے بدن میں یہ بجلیاں سی کس نے بھردی تھیں' وہ ایسے بھاگ رہا تھا جیسے ہرن صحراؤں میں چوکڑیاں بھر رہا ہو۔ پورا مجمع' پورا اسکول' اس کے ساتھی' اس کے استاد سبھی حیران تھے کہ آج ارسلان کے جسم و جان میں یہ پھرتی اور قوت کہاں سے آگئی۔

عین اس وقت جب ارسلان آخری راؤنڈ مکمل کررہا تھا اس کے ابو جاء نماز بچھائے اللہ سے دست بہ دعا تھے۔ "اے اللہ میں نے تیری رضا کی خاطر ظاہری خوشحالی کا راستہ ترک کردیا اور تنگی اور ترشی کو ترجیح دی۔ اے اللہ آج میری لاج رکھ لینا' میرے بچے کو سرخرو کرنا۔ اے اللہ میرے بچے کے سامنے میرا بھرم رکھ لینا۔"

پھر جب کچھ وقت بعد کامیابی کا سنہری تمغہ سینے پر سجائے ارسلان گھر میں داخل ہوا تو ابا اس سے لپٹ گئے۔ ان کی آنکھیں نم ہوگئیں اور بے اختیار ان کے منہ سے یہی نکلا۔ "ارسلان تم بھی جیت گئے اور تم نے مجھے بھی ہارنے سے بچالیا۔"

●●●

خواہش

○ کاش میں وہاں پیدا ہوتا جہاں کوئی گناہ نہ ہوتا۔

○ اگر کوئی گناہ نہ ہوتا تو وہاں کوئی بُرا نہ ہوتا۔

○ اگر کوئی بُرا نہ ہوتا تو وہاں کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہوتا۔

○ اگر کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہوتا تو وہاں کوئی خوف وہراس نہ ہوتا۔

○ اگر کوئی خوف وہراس نہ ہوتا تو وہاں کوئی پریشان نہ ہوتا۔

○ اگر کوئی پریشان نہ ہوتا تو وہاں امن ہوتا۔

○ اگر امن ہوتا تو میں اس دنیا میں نہیں بلکہ جنت میں ہوتا۔

○ اگر میں جنت میں ہوتا تو کس قدر خوش ہوتا۔

مرسلہ عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ

سنسنی خیز تفصیلات

آئندہ شمارے میں ضرور دیکھئے

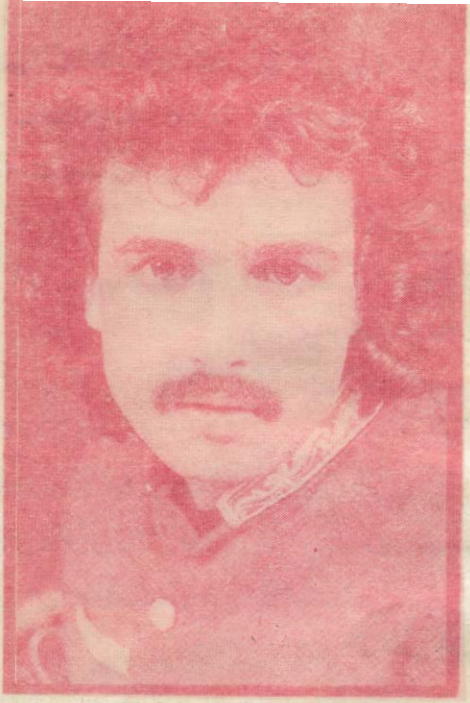

ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار

سیما صدیقی

سوہنی دھرتی، جیوے پاکستان، میں بھی پاکستان ہوں، دل دل پاکستان اور ہم ہیں پاکستانی جیسے "قومی نغمات" ہر پاکستانی کے دل کی آواز بن چکے ہیں۔ قومی نغمات نے ہر دور میں مقبولیت کے آسمانوں کو چھوا ہے۔ قومی نغمے اگر مؤثر ہوں تو ہمارے جذبوں کو مہمیز عطا کرتے ہیں۔ آج ہر بچہ اور ہر جوان "جذبہ جنوں" سے سرشار نظر آتا ہے۔ "ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار"

نے پاکستان بھر میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ک
ہے۔ اس نغمے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں جذ
حب الوطنی کے ساتھ، محنت، لگن، عزم، ہمت
اور جستجو کا پیغام بھی دیا گیا ہے اور یہی خوبی اسے
دیگر قومی نغمات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس نغمے
"ورلڈ کپ" کا "سرکاری نغمہ" قرار دیا گیا۔
بقول "عمران خان" "یہ نغمہ ہر اس پاکستانی کے
لئے ہے جو پاکستان کے لئے کچھ کرنے کا جذ

رکھتا ہے۔" "آنکھ مچولی" کے "مقابلہ نمبر" کے لئے اسی نغمے کے حوالے سے ہم نے "سلمان احمد" (جنون گروپ) سے بات چیت کی جو قارئین کی نذر ہے۔

☆ ہے جذبہ جنوں' آپ نے کس جذبے کے تحت تخلیق کیا؟

ورلڈ کپ کے دوران ہم نے سوچا کہ "پاکستانی کرکٹ ٹیم" کا حوصلہ بڑھانے میں' ہمارا بھی کچھ (Contribution) ہونا چاہئے۔ کیونکہ میں فرسٹ کلاس کرکٹر بھی رہا ہوں لہٰذا اس حوالے سے میں اس معاملے میں زیادہ جذباتی تھا۔"

☆ جب پاکستان "ورلڈ کپ" ہار گیا تو آپ کے کیا جذبات تھے؟

"ہمیں افسوس تو ہوا..... لیکن نہ ہم مشتعل ہوئے نہ پژمردہ! ہمارے نغمے کا موضوع بھی "ہار جیت" نہیں بلکہ "ہمت اور جستجو" تھا حالانکہ ورلڈ کپ کے دیگر نغمات میں "جیت" کو ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔ کھیل میں ہار جیت تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ اصل اہمیت اس "کوشش" کی ہے جو آپ نے کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا نغمہ "جذبہ جنوں" ورلڈ کپ کے بعد "ضائع" نہیں ہوا۔ جب کہ دیگر نغمات پس منظر میں چلے گئے۔"

☆ "جذبے کا جنوں بن جانے سے کیا مراد ہے؟

جذبہ حد سے گزر جاتا ہے تو وہ جنون بن جاتا ہے۔ جب انسان یہ فیصلہ کرلے کہ کسی چیز کے حصول کے لئے اسے ہر قیمت پر کوشش کرنی ہے تو وہ کسی مرحلے پر بھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتا۔ ایسے پُرعزم شخص پر ایک جنونی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور یہی کیفیت اسے کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔

☆ اس نغمے کے ذریعے آپ کیا پیغام دینا چاہتے تھے؟

"زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے' وہ لوگ جنہوں نے زندگی میں کچھ حاصل کیا' نام کمایا اور جن پر کتابیں لکھی گئیں' ان سے جب بھی کامیابی کا راز پوچھا گیا تو انہوں نے جستجو' کوشش' محنت' جذبے اور لگن کو ہی کامیابی کا ہتھیار قرار دیا۔ میں نے اپنے نغمے کے ذریعے اسی پیغام کو آگے بڑھایا ہے کہ انسان ناکامی سے نہ ڈرے کیونکہ ناکامی ہی کامیابی کی سیڑھی ہے۔ خلوصِ نیت سے محنت کرے اور کامیابی ناکامی کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دے۔ میری اپنی زندگی میں بھی یہی جذبہ کام آیا۔ ہم نے بہت سے "تجربات" کئے جو ناکام رہے۔ لوگوں نے ہمیں

بہت برا بھلا کہا' لیکن ہم اپنے کام میں لگے رہے جس سے نہ صرف ہمارے کام کا معیار بہتر ہوا بلکہ ہمیں عوام کی محبت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ آج کنسرٹ میں ہزاروں پاکستانی ہمارے ساتھ ہم آواز ہو کر "جذبہ جنوں" گاتے ہیں۔ جب ہم اس کی وڈیو ریکارڈ کرنے کے لئے لوکیشنز پر گئے تو سینکڑوں لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے نہایت جوش و جذبے سے ہمارا ساتھ دیا۔ اس گرم جوشی نے ہمیں مزید اعتماد فراہم کیا۔"

☆ آپ کو کب احساس ہوا کہ یہ نغمہ' ایک قومی نغمے کی حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے؟

"ابھی اس نغمے کو ٹی وی پر نشر ہوتے ہوئے چند ہی ہفتے ہوئے تھے کہ ہمیں ایک کنسرٹ میں مدعو کیا گیا وہاں جب ہم اسٹیج پر آئے تو چاروں طرف سے "جذبہ جنوں" کی صدائیں آنے لگیں۔اور ہم اس وقت حیران رہ گئے جب ہزاروں لوگوں نے ہمارے ساتھ اس نغمے کو گایا (یعنی لوگوں کو اس کے بول یاد ہو چکے تھے) ورلڈ کپ میں شکست کے باوجود ہم جہاں جاتے ہم سے اسی نغمے کی فرمائش ہوتی۔ چنانچہ ہم نے اس کی دوسری ویڈیو تیار کی جس میں کھلاڑیوں کے علاوہ' طالب علموں' ہنرمندوں 'مزدوروں اور دیگر شعبہ جات میں کام کرنے والوں کو نمایاں کرکے پیش کیا۔ وسیم اکرم' مشتاق اور اعجاز وغیرہ آج بھی اپنی پریکٹس کے دوران یہی نغمہ سنتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس گانے کو سن کر ہماری انرجی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔"

☆ اس نغمے کا شاعر کون ہے؟

ہمارے گانے "صابر ظفر" لکھتے ہیں۔ میں انہیں گانے کا "تھیم" بتاتا ہوں اور وہ میرے "محسوسات" کو شاعری کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ میں نے انہیں "جذبہ جنوں" کا تھیم بتایا۔ انہوں نے اس پر جو نغمہ لکھا اس کے ابتدائی بول یہ تھے' "لے کے چلیں اگر سب کو ساتھ' دیکھو گے ہمیں نہ ہوگی کبھی مات" یہ بول میرے جذبات اور آئیڈیے کی بھرپور ترجمانی نہیں کر پارہے تھے۔ چنانچہ میں خود کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا اور کافی سوچ بچار کے بعد یہ بول لکھے۔

"ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار' جستجو جو کرے وہ چھوئے آسماں" اس کے انترے وغیرہ البتہ صابر صاحب کے ہی لکھے ہوئے ہیں۔ کمپوزیشن میری ہے اور اسے گایا "علی عظمت" نے ہے۔

☆ کیا اس نغمے نے عام لوگوں کی زندگی کو بھی متاثر کیا اور کیا ایسی کوئی مثال آپ کے سامنے آئی؟

"مجھے "نواب شاہ" سے ایک خط آیا' یہ خط ایک سترہ سالہ نوجوان کا تھا جس نے لکھا تھا کہ میرے ماں باپ دونوں کا انتقال ہوچکا ہے' میں اپنی خالہ کے ساتھ رہتا ہوں۔ ہمارا تعلق انتہائی غریب طبقے سے ہے جس کی وجہ سے میں' باوجود شدید خواہش کے' تعلیم جیسی نعمت سے محروم ہوں۔ مستقبل میں اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ مجھ پر ایک ایسا وقت بھی گزرا جب میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ "خودکشی" ہی میرے تمام مسائل کا حل ہے۔ میں نے کسی طرح ریوالور کا انتظام بھی کرلیا پھر عین اسی وقت مجھے ریڈیو پر "ہے جذبہ جنوں" کی آواز سنائی دی جو باہر کسی نے لگا رکھا تھا۔ نہ جانے اس گیت میں کیا تاثیر تھی کہ میں نے اپنا خودکشی کا ارادہ تبدیل کردیا۔ مایوسی کا شدید غلبہ جو مجھ پر طاری تھا' وہ چھٹنے لگا اور مجھے اپنی حرکت حماقت معلوم ہونے لگی۔"

اس نوجوان کا خط میرے پاس آج بھی محفوظ ہے۔ اسی طرح کا واقعہ ہمارے ایک شناسا کے ساتھ پیش آیا۔ انیس سالہ یہ نوجوان نہایت ایکٹو اور اسمارٹ تھا اور جمنازیم میں کام کرتا تھا۔ ایک دن ویٹ لفٹنگ کرتے ہوئے ویٹ اس پر گرگیا اور وہ مفلوج ہوکر رہ گیا۔ ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا۔ اس حادثے کے بعد اُس کی شخصیت ہی بدل گئی اس کے مزاج میں انتہائی درجے کی بدمزاجی آگئی۔ وہ بات بے بات' ہر ایک سے لڑتا جھگڑتا' اس نے نشہ آور اشیاء بھی استعمال کرنی شروع کردیں۔ اس کے ایک دوست نے اسے "جذبہ جنوں" کا کیسٹ دیا۔ اس کے گھر والوں کا کہنا ہے کہ وہ یہ گانا دن میں سات آٹھ مرتبہ سنتا ہے۔ اس کے مزاج میں بہ تدریج تبدیلی آنی شروع ہوئی اور اس کا رویہ قدرے معتدل ہوتا گیا۔ اب وہ کوشش کرتا ہے کہ زندگی کی مصروفیات اور دلچسپیوں میں حتی المقدور حصہ لے سکے۔"

☆ ہمارے نوجوان ناانصافیوں کا شکار ہیں۔ آپ کے گانے کا "جذبہ" زیادہ قوی ہے یا ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ناانصافیاں شدید ہیں؟

"تاریخ گواہ ہے کہ انسانی جذبہ ہمیشہ قوی اور غالب رہا ہے۔ ہمارا مذہب بھی ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے کہ "مایوسی گناہ ہے"۔ اور میں اس پر پختہ یقین رکھتا ہوں۔ جب ہم اپنا ذہن بدلیں گے تو ہمارا سماج بھی بدلے گا۔ چند فی صد لوگ ہم پر حکومت کررہے ہیں اور ساری ناانصافیاں انہیں کے دم قدم سے ہیں۔ ہمارے ہاں کرپشن کے الزامات کے تحت آٹھ سال میں چار اسمبلیاں

توڑی گئیں' کیا ایک آدمی بھی کیفر کردار تک پہنچا ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ ہمیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ کیا ہم اُلّو بنتے رہیں گے؟ یا ہم اٹھ کھڑے ہوں گے اور ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ ہم اپنے ڈرائنگ رومز اور گھر کے دالانوں میں بیٹھ کر ناانصافی اور بدعنوانی کا رونا تو روتے ہیں مگر عملی طور پر کچھ نہیں کرتے۔ ہر شخص اپنی جگہ یہ سوچ کر رہ جاتا ہے کہ ایک ہمارے کہنے یا کرنے سے کیا ہوگا؟ مراعات یافتہ حاکم طبقہ صرف چند فی صد ہے جبکہ مظلوم اور محروم طبقہ کروڑوں کی تعداد میں ہے۔ اگر ہم طوفان کی طرح اٹھ کھڑے ہوں تو انہیں خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاسکتے ہیں۔"

☆ "مقابلہ نمبر" کے حوالے سے آپ آنکھ مچولی کے قارئین کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

"میں بس یہی کہوں گا کہ مقابلہ ہو یا کوئی امتحان' آپ فیل ہونے سے نہ ڈریں۔ یہ نہ سوچیں کہ ناکامی کی صورت میں لوگ آپ کا مذاق اڑائیں گے۔ کیونکہ اس طرح آپ کبھی کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہ دے سکیں گے اور نہ ہی کوئی نیا تجربہ کرسکیں گے' بقول شخصے "کامیابی کو کبھی دماغ میں اور ناکامی کو کبھی دل میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔" ناکامی زندگی کا حصہ ہے لہٰذا ہمت ہارے بغیر اگر آپ جستجو میں لگے رہے تو یقیناً" کامیابی کے آسمان کو چھولیں گے اور انشاء اللہ زندگی کے ہر "مقابلے" میں "فتح" آپ کا مقدر ہوگی۔"

●●●●

لٹل ماسٹر حنیف محمد کے چند دلچسپ ریکارڈ

پاکستان کی طرف سے تاحال بننے والی ٹیسٹ سنچری (۳۳۷ رنز) حنیف محمد نے بنائی تھی۔ حنیف محمد وہ پہلے پاکستانی بیٹسمین ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ٹیسٹ کرکٹ میں ایک ہزار رنز مکمل کئے۔ حنیف محمد کو پاکستان کی طرف سے ٹیسٹ کرکٹ میں اولین نصف سنچری بنانے کا اعزاز حاصل ہے۔

رانا محمد شاہد' بورے والا

دیے تم جلاؤ

پروفیسر محمد نعیم علی خان گوہر

زمانے کی گردش سے گھبرا نہ جاؤ
وفا کے دیئے آندھیوں میں جلاؤ

افق تا افق چھا نہ جائیں اندھیرے
اٹھو اپنے خوں سے دیئے تم جلاؤ

ہے آتا ہمیں آشیاں پھر بنانا
کہو بجلیوں سے ہمیں نہ ڈراؤ

نہیں ان کو کوئی غرض آشیاں سے
چٹانوں میں ہوتا ہے جن کا پڑاؤ

خودی کے امیں کو بھنور کا ہے کیا ڈر
بدلتے ہیں اس کی نظر سے بہاؤ

چمن میں اداسی کا موسم نہ آئے
خزاں کی ہواؤں سے اس کو بچاؤ

چمن کو جو اپنے سجانا ہے تم کو
نئے موسموں کے بھی پودے لگاؤ

زمانے کے ہاتھوں جو بکھرے ہیں گوہر
چلو پھر سے مالا تم ان کی بناؤ

مدِمقابل...

شاہد محمود

مقابلوں سے تو دنیا کا کوئی دور خالی نہیں مگر اسی دنیا میں کچھ مقابلے ایسے ہوئے ہیں جو تاریخ کا حصہ بن گئے یہ مقابلے ایسے انوکھے اور عجیب و غریب تھے کہ سینکڑوں، ہزاروں برس کا عرصہ بھی ان پر وقت کی گرد نہ ڈال سکا اور یہ تاریخ کے صفحات پر گویا کہ نقش ہو کر رہ گئے۔ ایسا ہی ایک مقابلہ کئی سال پہلے ایران اور توران کی فوجوں کے جوانوں میں ہوا۔ جس کے نتیجے میں دو دلاور ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن کر آمنے سامنے کھڑے ہوگئے۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے مگر دونوں نہیں جانتے تھے کہ وہ ایک ہی خون ہیں۔ ان میں ایک باپ تھا اور دوسرا بیٹا۔

توران کا بادشاہ اس زمانے میں، افراسیاب اور ایران کا بادشاہ کیکاؤس تھا۔ کیکاؤس کا فوجی سردار رستم تھا جس کی بہادری سے بڑے بڑے

بہادروں کا پتہ پانی ہوتا تھا اور صرف اس کا نام سن کر ہی دشمنوں کے دل میں خوف پیدا ہوجاتا تھا۔

یہی رستم ایک دفعہ شکار پر گیا۔ دوپہر کے وقت اسے ایک ہرن نظر آیا۔ ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے وہ ایران کی سرحد سے باہر نکل گیا۔ مگر اسے کیا پریشانی تھی۔ اس نے ہرن کو شکار کیا۔ اس کو بھون کر کھایا اور بڑے مزے سے درخت کے سائے میں سوگیا۔ آنکھ کھلی تو اس کی ملاقات وہاں کی شہزادی سے ہوئی اور بالآخر اس کی شادی اس شہزادی سے ہوگئی۔

رستم جب واپس ایران کی طرف چلا تو اس نے شہزادی کو ایک نشانی دی اور کہا "اگر لڑکا پیدا ہو تو اس کے بازو پر یہ باندھ دینا اور اگر لڑکی پیدا ہو تو مجھے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔"

شہزادی کے ہاں لڑکا پیدا ہوا یہ لڑکا شکل و شباہت میں، عادات و اطوار میں رستم سے بہت ملتا تھا۔ شہزادی نے سوچا کہ اگر رستم کو معلوم ہوگیا کہ اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے تو وہ بچے کو اپنے ساتھ لے کر چلا جائے گا۔ چنانچہ بیٹے کی محبت میں اس نے رستم کو یہ اطلاع بھجوادی کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ اس نے لڑکے کا نام سہراب رکھا۔ سہراب شروع ہی سے باپ کی طرح دلیر اور طاقتور تھا۔ اس کی بہادری کے کارنامے سُن سُن کر لوگ حیرت میں پڑجاتے۔ سہراب بار بار اپنے باپ کے پاس جانے کے لئے اپنی ماں سے اجازت طلب کرتا مگر ماں یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ "اس کا کہیں پتا نہیں نہ جانے وہ کس مقام پر جنگ میں پھنسا ہوگا۔" سہراب کے دل میں باپ سے ملنے کی خواہش زور پکڑتی گئی۔ وہ اپنے بہادر باپ کی خدمت میں رہ کر دشمنوں کا صفایا کرنا چاہتا تھا۔

وہ علاقہ جہاں کی شہزادی سے رستم نے شادی کی تھی توران کے قریب تھا۔ رفتہ رفتہ سہراب کی شہرت توران تک بھی پہنچ گئی۔ توران کے بادشاہ نے سوچا کہ اگر اس نوجوان کو رستم سے لڑا دیا جائے تو ضرور اس کو فتح ہوگی۔ اس طرح وہ رستم کو نیچا دکھا سکے گا۔ اس نے اس نوجوان کے خلاف سازش کرکے اسے اپنی فوج میں بھرتی کرلیا۔ اسے امید دلائی کہ تم کو رستم سے ملادیں گے اور پھر پوری تیاری سے ایران پر چڑھائی کردی۔

ان دنوں رستم کہیں باہر لڑنے گیا ہوا تھا۔ توران کی فوج پہنچی تو لوگ خوفزدہ ہوگئے۔ ایران میں بڑے بڑے جنگجو تھے۔ مگر سہراب نے اپنی قوت سے ایک کے بعد ایک سب کو پچھاڑ دیا۔ دن تو جیسے تیسے کٹ گیا مگر رات کو ایرانی

سورماؤں میں صلاح ہونے لگی کہ اب کیا کیا جائے۔ ان کو فکر تھی کہ اگر راتوں رات رستم کو نہ بلایا گیا تو صبح سہراب کے سامنے میدان میں کون جائے گا؟ ایران کی شان و شوکت تو مٹی میں مل جائے گی۔ چنانچہ راتوں رات آدمی دوڑائے گئے اور بڑی عاجزی کے ساتھ رستم سے درخواست کی گئی کہ وہ اس نازک موقع پر ایران اور اس کی عزت بچائے۔ رستم اطلاع ملتے ہی چل پڑا۔ صبح ہوتے ہوتے وہ ایرانی فوج میں پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر ایرانیوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔

اگلی صبح جب ایران اور توران کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوئیں تو ادھر سے سہراب اپنے پورے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہوا اور ادھر سے رستم بھی اپنی آن بان کے ساتھ نکلا۔ مگر سہراب کو دیکھ کر رستم دل میں تھوڑا سا خوفزدہ ہوا۔ اس نے اپنے زمانے میں اس قدر بہادر اور شہ زور نوجوان اس سے پہلے کہیں نہ دیکھا تھا۔ ادھر سہراب بھی جانتا تھا کہ رستم کے علاوہ اسے کوئی بھی پچھاڑ نہیں سکتا۔ رستم کے ڈیل ڈول انداز کو دیکھ کر دل میں خیال گزرا کہ "کہیں یہ رستم تو نہیں؟" اپنے اسی خیال کے تحت اس نے رستم سے پوچھا۔ "کیا تمہارا نام رستم ہے؟"

رستم نے سوچا اگر اسے نام بتادیا اور اس کے ہاتھوں شکست کھائی تو کتنی بدنامی ہوگی۔ اس لئے اس نے کہا۔ "رستم تم جیسے بزدلوں کے سامنے نہیں آتا۔ پہلے مجھ سے طاقت آزمائی کرلو۔ پھر رستم سے لڑنے کی جرأت کرنا۔"

اتنا سنتے ہی سہراب رستم پر ٹوٹ پڑا۔ رستم نے بھی تلوار سنبھالی۔ مگر اس کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اس نوجوان سے ٹکر لینا معمولی بات نہیں۔ اس نے مختلف داؤ پیچ آزما کر خود کو محفوظ رکھا۔ آخر شام کے وقت کشتی کا مقابلہ ہوا اور سہراب نے رستم کو زمین پر گرادیا وہ چاہتا تو اسی وقت رستم کو مار سکتا تھا مگر اس کی غیرت و بہادری نے دشمن کو ایک موقع اور دے دیا۔ شام کے وقت تورانی فوج میں خوشیاں منائی جارہی تھیں جبکہ ایرانی فوج میں ماتم برپا تھا۔ ایران کی شہرت خاک میں مل گئی تھی۔

رات کے سناٹوں میں رستم خدا سے دعا کررہا تھا "پروردگار! اس بڑھاپے میں میری لاج رکھ لے۔ مجھے پھر سے وہ قوت و توانائی دے دے کہ میں اپنے نوجوان دشمن کو زیر کرلوں۔" خدا نے اس کی دعا قبول کرلی۔ دوسرے دن لڑائی پھر شروع ہوئی اور کچھ ہی دیر بعد رستم نے موقع پاکر سہراب کو زمین پر پٹخ دیا لیکن اس خوف سے

کہ کہیں وہ دوبارہ کھڑا نہ ہوجائے۔ فوراً کٹار نکال کر اس کے سینے میں گھونپ دی۔ سہراب بے ہوش ہوگیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو بولا "تم نے دھوکے سے مجھ پر وار کیا ہے۔ اس کا بدلہ میرا باپ ضرور لے گا۔" رستم نے پوچھا "تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟" سہراب نے کہا "رستم"

رستم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسے شک گزرا کہ "کہیں یہ نوجوان دھوکا نہ دے رہا ہو۔" وہ گھبرا کر بولا "رستم کے تو کوئی لڑکا تھا ہی نہیں۔ تم اس کے بیٹے کیسے ہونے لگے؟" سہراب نے اپنا بازو دکھا کر کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں جھوٹ بولوں گا اور وہ بھی مرتے وقت؟ یہ دیکھو میرے بازو پر میرے باپ کی دی ہوئی نشانی ہے جو میری ماں نے چلتے وقت باندھی تھی۔"

رستم نے آستین الٹا کر نشانی دیکھی تو ایک زور دار چیخ مار کر زمین پر گر گیا۔ چاہتا تھا کہ وہی کٹار اپنے کلیجے میں گھونپ لے۔ مگر سہراب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسے اپنی محبت و زندگی کا واسطہ دے کر اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ کچھ دیر بعد سہراب چل بسا۔ رستم بلند آواز میں رو رو کر کہنے لگا۔

"ہائے۔ مجھ سے بڑا بدنصیب کون ہوگا؟ جس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو موت کی نیند سلادیا۔" کہتے ہیں کہ نیم دیوانگی کی حالت میں وہ اپنے بیٹے کی لاش ہاتھوں پر اٹھا کر پہروں مارا مارا پھرتا رہا کہ کوئی اس کے بیٹے کی زندگی کو واپس لے آئے لیکن کبھی روح بھی بدن سے نکل کر واپس آئی ہے؟ ●●●

بات کا وزن

ایک پہلوان نما آدمی ایک بڑا سا لکڑی کا لٹھا سر پر لادے گالیاں بکتا چلا جارہا تھا۔ ادھر سے ایک بزرگ کا گزر ہوا۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ "کسے گالیاں دے رہے ہو؟"

"ایک شخص نے مجھے گدھا کہا ہے۔" اس نے بتایا' بزرگ نے فرمایا۔

"تو اتنا بڑا بوجھ اٹھا سکتا ہے مگر ذرا سی بات کا وزن برداشت نہیں کر سکتا؟"

حلیمہ ناز' عبدالستار' کراچی

تاریخ کے عجیب و غریب مقابلے

رمیتصا سلیم

قدیم یونانی کہاوت کے مطابق یونان کے جزیرہ "کریٹ" میں واقع ناسس کے محل کی بھول بھلیوں میں ایک ایسا دیو رہا کرتا تھا جس کا آدھا جسم انسان کا اور سوئیل کی طرح تھا۔ ایتھنس سے ہر سال ایک بچہ اس دیو کی بھینٹ چڑھایا جاتا آخر کار ایتھنس کے نوجوان شہزادے نے ناسس کے محل جا کر اس عجیب الشکل دیو کو للکارا اور زبردست مقابلے کے بعد اسے ہلاک کر دیا

۳۳۶ قبل مسیح سے تعلق رکھنے والا باکسنگ کا یہ منظر، دراصل ایک خوب صورت مرتبان سے لیا گیا ہے۔ اس مرتبان میں زیتون کا تیل بھر کر ان ایتھلیٹس کو انعام کے طور پر دیا جاتا تھا جو ایتھنس میں ہونے والے مقابلوں میں فاتح قرار پاتے۔ ڈرائنگ کا یہ مخصوص انداز باکسرز کے پٹھوں کو یا ان کی قوت کو ظاہر کرتا ہے جبکہ ہاتھوں میں گلووز کی جگہ چمڑے کی پٹیاں ہیں جو اس زمانے میں باکسرز پہنا کرتے تھے۔

پانچویں صدی کے ایک مشہور مؤرخ "ہیروڈوٹس" کا خیال ہے کہ بورڈ گیم کا آغاز ایشیا میں "لیڈیا" کے مقام سے ہوا۔ قدیم آثار سے ایسے گیم دستیاب ہوئے ہیں جو پتھر، ہڈی یا مٹی وغیرہ سے بنے ہوئے ہیں اور آج کی "لوڈو" یا "سانپ سیڑھی" اور "شطرنج" وغیرہ سے بہت مشابہہ ہیں۔ اس تصویر میں اُس دور کے دو یونانی ہیرو "اجیکس" اور "ایچیلز" ایسا ہی کوئی کھیل کھیل رہے ہیں۔

"پرسس" اس یونانی ہیرو کا نام ہے جس نے پروں والی عجیب و غریب عورت کا سر قلم کیا۔ عورت کا سر قلم کرنا یوں تو بہادری کی بات نہیں مگر اس روایت کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جو کوئی بھی اس عورت کا سر قلم کرنے جاتا وہ اسے دیکھتے ہی پتھر کا بن جاتا۔ "پرسس" نے اس عورت کے بجائے اپنی نظر اپنی چمکتی ہوئی ڈھال میں نظر آنے والے اپنے عکس پر رکھی، یہاں تک کہ وہ اس عورت تک جا پہنچا اور اس کا سر اتار کر اپنے ساتھ لے آیا۔

اولمپک

اولمپک مقابلوں کی تصویری رُوداد

جوش، جذبے، جنون اور جدوجہد کے حسین لمحے

نسرین شاہین

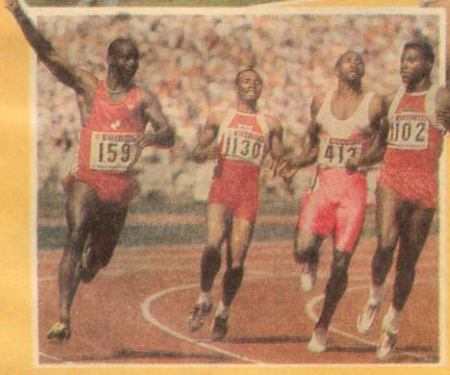

جو جیت گئے تو جیت گئے ہارے بھی تو بازی مات نہیں

۷۷۶ قبل مسیح یونان سے شروع ہونے والے مقابلے آج بھی ہر چار سال بعد منعقد ہوتے ہیں۔ ہر مرتبہ یہ مقابلے پہلے سے زیادہ دل چسپ اور سنسنی خیز ہوتے ہیں۔ سیکڑوں کھلاڑی کروڑوں انسانوں کے دلوں کی دھڑکن بن کر قوموں اور ملکوں کو شہرت، عزت اور احساسِ تفاخر عطا کرتے ہیں۔

کھیل ہزاروں سالوں سے تفریح طبع کا ذریعہ بنے رہے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے جبکہ مختلف کھیل ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت بھی شکار کو ایک کھیل ہی کی حیثیت حاصل تھی اور شکاری اس کو اپنی صحت و توانائی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ شکار کے ذریعے اپنے جسم کو متوازن رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جو جتنا زیادہ ماہر ہوتا تھا جسمانی اور دماغی لحاظ سے اتنا ہی برتر سمجھا جاتا تھا۔

دنیا میں ہونے والے اولین کھیلوں کا جو بیان مغربی ادب کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ انہی میں سے "ایلیا" نامی کتاب میں بھی بہت سی تفصیلات ملتی ہیں ہومر نے یونانی ہیرو ایکلیز کے جنازے پر ہونے والی رسومات کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ رسومات ایکلیز کے دوست پیٹروکلس نے ادا کی تھیں، اس تقریب میں بڑے بڑے یونانی سردار شریک تھے اور اس میں کچھ ایسے کھیل بھی تھے جو شرکاء کی طاقت کی نمائش کے لئے ترتیب دیئے گئے تھے۔ مثلاً" رتھوں کی دوڑ، مکابازی، کشتی، دوڑ اور شمشیرزنی کے مقابلے وغیرہ ۔ اسی طرح تیراندازی اور بھالے پھینکنے کے مقابلے بھی ہوا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سارے کھیل جنگجوئی اور شہہ زوری سے عبارت تھے۔ مسابقت کی روح ان میں کلیدی حیثیت رکھتی تھی۔ پہلے یہ کھیل روایت تھے پھر یہ تاریخ کا حصہ بن گئے۔

یوں تو دنیا بھر میں کھیلوں کے بہت سے مقابلے منعقد ہوتے ہیں مگر ان میں سے سب سے زیادہ مقبول اولمپک کھیلوں کے مقابلے ہیں۔ اولمپک کھیلوں کی ابتداء سنہ 776 قبل از مسیح میں یونان کے شہر اولمپیا سے ہوئی۔ ابتداء میں یہ مقابلے 100 گز کی دوڑ تک محدود تھے۔ اس دوڑ کو یونانی میں "اسٹیڈ" کہتے تھے اور اس وجہ سے میدان کا نام "اسٹیڈیم" پڑا۔ یہ کھیل پوری بارہ صدیوں تک بلاناغہ ہر چار سال بعد منعقد ہوتے رہے، ان کھیلوں کے تمام قوانین یونانیوں نے بنائے تھے۔ انہوں نے ان مقابلوں کو مذہبی تہواروں کا درجہ دیا اور ان کے انعقاد کے لئے ادوار مقرر کئے۔ اولمپیا، یونان کے جنوب مغربی علاقے میں واقع ایک جگہ تھی۔ یہاں ہونے والے کھیلوں کی تقریب یونان کے سب سے بڑے دیوتا، "زیوس" کے اعزاز میں منعقد کی جاتی تھی۔ یہی کھیل آج کل اولمپک گیمز کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

ازمنہ قدیم میں اولمپک کھیلوں کا جشن صرف ایک دن ہوتا تھا، پھر اس کے لئے پانچ دن

مقرر کئے گئے۔ اور جیتنے والے کو شاہ وقت "زیتون" کے درخت کی نرم "پتیوں کا تاج" پہناتا تھا۔ تاہم انہیں اصل خراجِ تحسین شہرت کی ناموری کی شکل میں ملتا تھا۔ شعراء ان پر قصیدے لکھتے تھے اور انہیں ریاستیں بے بہا عزت و توقیر سے نوازتی تھیں۔ اکثر ان کے مجسمے بنا کر سڑکوں پر نصب کیے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ جشن یونان کا مقبول جشن بن گیا اور پھر دیگر کھیل بھی اس میں شامل ہوتے گئے۔ یہ کھیل پوری بارہ صدیوں تک ہر چوتھے سال منعقد ہوتے رہے یہاں تک کہ عیسائی رومی شہنشاہ "تھیوڈوس" نے اولمپک کھیلوں پر پابندی عائد کردی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ کھیل وحشیانہ ہیں۔

جن بارہ صدیوں میں یہ کھیل جاری رہے تھے، ان میں یونان کی تمام آزاد ریاستوں کے علاوہ ہر اس ملک کے لوگوں کو شرکت کی اجازت تھی جہاں یونانی زبان بولی جاتی تھی۔ کریمیا سے اسپین تک کے کھلاڑی اس میں شرکت کے لئے آتے تھے۔ یہ کھیل گویا یونان کے سینکڑوں شہریوں کو ایک رشتے میں جوڑنے کا سبب تھے۔ ان کھیلوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب یہ کھیل منعقد ہوتے تو تمام ریاستیں اپنی جنگیں تک ملتوی کردیتی تھیں تاکہ کھلاڑی اس میں حصہ لینے کے لئے جاسکیں اور یہ عظیم الشان کھیل پرامن ماحول میں منعقد ہوسکیں۔ رومی شہنشاہ "تھیوڈوس" کے ان کھیلوں پر پابندی لگائے جانے کے کوئی پندرہ صدیوں بعد تک یہ کھیل بس تاریخ کا ایک حصہ بنے رہے اور صرف یادداشتوں تک محدود رہے لیکن پھر ایک فرانسیسی عالم "بیرن پی اے ڈی بیرتن" نے ان کھیلوں کے انعقاد کے لئے تحریک چلائی جس کی وجہ سے یہ کھیل سنہ 1896ء میں دوبارہ شروع ہوگئے اور اب تک مسلسل ہر چار سال بعد منعقد ہورہے ہیں۔ ماسوائے جنگ اول اور دوئم کے۔ ذرا غور کریں قدیم یونان میں کھیل کے لئے جنگیں ملتوی کردی جاتی تھیں مگر آج کل اگر جنگ ہونے لگے تو یہ کھیل روک دیئے جاتے ہیں۔ 490 قبل از مسیح کو یونان کے فوجیوں نے میراتھن کے مقام پر ایک جنگ جیتی اس فتح کی خوشخبری سنانے کے لئے انہوں نے میراتھن سے ایتھنز کا راستہ دوڑتے ہوئے طے کیا تھا "میراتھن ریس" کا نام اسی واقعے کی یادگار ہے۔

قدیم زمانے کی طرح آج بھی "زیوس دیوتا" کے مندر کے کھنڈرات میں آتشی شیشے کی مدد سے ایک مشعل روشن کی جاتی ہے اور قدیم

دیویوں کا لباس پہنے ہوئے لڑکی کو دی جاتی ہے اس کے بعد یہ مشعل مختلف افراد کے ہاتھوں سے گزر کر اس مقام پر آتی ہے جہاں اولمپک کھیل منعقد ہورہے ہوتے ہیں' مشعل بردار شخص اولمپک کے میدان میں پہنچ کر مشعل کو مقررہ مقام پر نصب کردیتا ہے جو دو ہفتوں تک مسلسل جلتی رہتی ہے۔ اولمپکس میں پہلے اولمپک فاتح کو ریس کہا جاتا ہے۔ الجزائر کے "الغوانی" نامی کھلاڑی وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے سنہ 1928ء میں ایمسٹرڈم میں ہونے والے اولمپکس مقابلوں میں میراتھن ریس جیت کر طلائی تمغہ جیتا تھا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سنہ 1984ء کے لاس اینجلز اولمپکس مقابلوں میں جو گولڈ میڈل دیئے گئے وہ اصلی سونے کے نہیں تھے بلکہ ان میں 95 فیصد چاندی استعمال کی گئی تھی اگر گولڈ میڈل کو مالی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی قیمت 450 ڈالر ہوگی۔

اولمپک کھیلوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں حصہ لینے والے افراد صرف نام اور شہرت کے لئے حصہ لیتے ہیں' یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان کھیلوں میں صرف وہی کھلاڑی یا ایتھلیٹ حصہ لے سکتے ہیں جو ایمیچر ہوں یعنی وہ کھلاڑی جو کھیل کو بطور پیشہ نہیں اپناتے۔

اولمپک کھیلوں کی تاریخ کا ذکر کیا جائے اور "پینٹا تھلون" کا ذکر نہ ہو تو اولمپک کھیلوں کی تاریخ ادھوری رہ جائے گی۔ دراصل پینٹا تھلون یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی پانچ عدد کے ہیں۔ کھیلوں میں پینٹا تھلون کا لفظ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پانچ کھیلوں کا مجموعہ "پینٹا تھلون" کہلاتا ہے۔ یہ کھیل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور ان میں مطابقت نہیں ہوتی۔ یعنی گھڑسواری' نشانہ بازی' شمشیر زنی' تیراکی اور ان تمام کھیلوں میں حصہ لینے والا کھلاڑی "کراس کنٹری دوڑ" کے مقابلے میں شرکت کرتا ہے۔

جدید اولمپکس کے برعکس قدیم اولمپکس میں پینٹا تھلون کے مقابلے آج سے بالکل مختلف انداز کے ہوا کرتے تھے۔ قدیم اولمپکس میں جو مقابلے پینٹا تھلون میں شامل تھے' ان میں لانگ جمپ' فٹ ریس' ڈسک تھرو' جیولین تھرو اور ریسلنگ کے مقابلے بھی شامل تھے۔ جدید اولمپکس کے حوالے سے "پیری ڈی کو برٹن" کا نام لیا جاتا ہے انہوں نے جہاں دوسرے کھیلوں کے لئے جدید اولمپکس میں شمولیت کے لئے سفارشات پیش کیں وہاں پینٹا تھلون کو جدید طرز پر استوار کرنے کے بعد اولمپکس میں شامل کرنے کی کوششیں بھی

کھیلوں کے آغاز ہی سے شروع کردی تھیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ "پیری ڈی کوبرٹن" کے اس منصوبے کو ایک طویل عرصے تک قبول نہیں کیا گیا۔ آخر کار سنہ 1909ء میں کوبرٹن کی ان تھک کوشش کے بعد اس کھیل کو اولمپکس میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔

جدید پینٹاتھلون پانچ مختلف کھیلوں (گھڑسواری، نشانہ بازی، شمشیرزنی، تیراکی اور کراس کنٹری دوڑ) پر مشتمل ہوتا ہے جس میں حصہ لینے والے کھلاڑی کی ماہرانہ صلاحیتوں کا اجتماعی مظاہرہ ہوتا ہے۔ ان کھیلوں میں مجموعی کارکردگی کی بنیاد پر کھلاڑی فاتح قرار پاتا ہے۔ ابتدائی جدید اولمپکس میں اس کھیل میں شرکت کرنے والوں میں فوجی افسروں کی تعداد نمایاں ہوتی تھی۔ جس سے ایک تاثر یہ پیدا ہوگیا تھا کہ جدید پینٹاتھلون میں صرف فوجی افسر ہی کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ شائقین ایک عرصے تک ایسا دیکھتے رہے تھے دراصل "پیری ڈی کوبرٹن" نے اس کھیل سے منسوب منطق یوں بیان کی ہے کہ "ایک فوجی اپنے گھوڑے پر سوار ہے اور مخالف دشمن کے علاقے میں گھس جاتا ہے۔ دشمن کی کارروائی سے گھوڑا بے قابو ہوجاتا ہے اور دشمن کی مختلف رکاوٹوں کو پھلانگتا ہوا مزید اندر چلا جاتا ہے۔ راستے میں اس کو روکنے کے لئے گولیاں چلائی جاتی ہیں جس کا مقابلہ وہ اپنے پستول سے کرتا ہے اور جب گولیاں ختم ہوجاتی ہیں تو وہ اپنے دفاع کے لئے اپنے پاس موجود تلوار سے دشمن کا مقابلہ کرتا ہے اس دوران وہ اپنے گھوڑے سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اب جان بچانے کے لئے وہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن راستے میں دریا حائل ہوجاتا ہے جس کو وہ تیر کر عبور کرتا ہے اور اپنے علاقے میں جانے کے لئے مزید راستہ دوڑ کر طے کرتا ہے۔"

جدید پینٹاتھلون سخت، دشوار اور مردانہ کھیل کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لئے شروع میں اس کو فوجی تربیت کا حصہ بنالیا گیا تھا جس کی وجہ سے شائقین اولمپکس میں پینٹاتھلون کے مقابلوں میں فوجی افسروں کو شریک ہوتے دیکھا کرتے تھے یا پھر امیر اور جاگیردار افراد ہی اس کھیل کو کھیلا کرتے تھے کیونکہ یہ ایک مشکل کھیل ہونے کے ساتھ ساتھ مہنگا کھیل بھی تھا۔ "پیری ڈی کوبرٹن" کو یہ بات بالکل پسند نہ تھی کہ اس کھیل میں صرف فوجی یا امیر لوگ ہی حصہ لیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر طبقے کا کھلاڑی اس کھیل میں شامل ہوسکے، کیونکہ ایک ایسا کھلاڑی

جو تمام کھیلوں میں مہارت رکھتا ہو لیکن گھوڑوں کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہ ہو وہ اس کھیل میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے تجویز پیش کی کہ آرگنائزنگ کمیٹی ایسے کھلاڑیوں کو گھوڑے مہیا کردے جو گھوڑے نہیں لاسکتے۔" پیری ڈی کوبرٹن" کی یہ تجویز جدید پینٹاتھلون کے عالمی مقابلوں میں قوانین کا حصہ ہے۔ جدید پینٹاتھلون میں ہونے والے مقابلوں کے قوانین اور کھلاڑیوں کو کن کن ضابطوں کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ آیئے اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

گھڑسواری :

جدید پینٹاتھلون میں مقابلے کا آغاز گھڑسواری سے ہوتا ہے۔ سوار کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ کورس میں چھ سو (600) میٹرز کا فاصلہ طے کرے اِس دوران راستے میں موجود پندرہ (15) رکاوٹوں کو بھی عبور کرے۔ ایک اچھا گھڑسوار اپنے اور گھوڑے کے درمیان ایک فوری ہم آہنگی کے ساتھ مقابلے میں شریک ہوتا ہے گھوڑے موجودہ دور میں کھیلوں کے منتظمین مہیا کرتے ہیں۔ سوار کے لئے یہ بھی لازمی ہوتا ہے کہ وہ چھ سو میٹر کی دوڑ گھوڑے کو روکے بغیر مکمل کرے' اس میں گھڑسوار کے لئے 350 میٹرز فی منٹ کی رفتار درکار ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر گھڑسوار کے لئے (1100) پوائنٹس ہوتے ہیں جو اس کو بغیر غلطی کئے ہوئے رکاوٹیں عبور کرجانے کی صورت میں ملتے ہیں۔ مقابلے میں وقت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ایک سیکنڈ بھی غیر ضروری خرچ ہوجائے تو کھلاڑی کے اسکور میں سے دو پوائنٹس کاٹ لئے جاتے ہیں۔اور اگر مقابلے کے دوران رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رکاوٹ گرجائے تو گھڑسوار کے اسکور میں سے 30 پوائنٹس کم ہوجاتے ہیں اور اگر سوار خود گر جائے تو 60 پوائنٹس کم ہوجاتے ہیں۔

نشانہ بازی :

نشانہ بازی (شوٹنگ) میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ نشانہ باز تیزنگاہ کا مالک ہو جو مقابلے کے دوران اپنی بھرپور توجہ اور مضبوط اعصاب کے ساتھ مقابلے میں شریک ہو۔ ہر کھلاڑی کو اس مقابلے کے لئے پستول یا ریوالور استعمال کرنا ہوتا ہے۔مقابلے میں ہدف 25 میٹرز کے فاصلے پر ہوتا ہے اِس ہدف کے نشانہ باز کو نظر آنے کا وقت صرف تین سیکنڈ ہوتا ہے اور

دوبارہ یہ ہدف سات سیکنڈ کے لئے نظر آتا ہے۔ ہدف کے اردگرد مختلف رنگوں کے دائرے بنے ہوتے ہیں۔ صحیح نشانہ لگانے پر کھلاڑی کو 95 پوائنٹس ملتے ہیں۔ ہدف سے ہٹ کر نشانہ لگنے کی صورت میں صرف 22 پوائنٹس ملتے ہیں۔ مجموعی طور پر 20 گولیاں اگر صحیح نشانہ پر لگائی جائیں تو کھلاڑی کل 1132 پوائنٹس اسکور کرتا ہے۔

شمشیرزنی :

شمشیرزنی یا تلوار بازی (فینسنگ) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کھیل بہت زیادہ چابک دستی، مہارت اور ہوشیاری کا طالب ہوتا ہے۔ شمشیرزنی کے ایک مقابلہ کا دورانیہ تین منٹ ہوتا ہے۔ ان تین منٹوں میں اگر دونوں شمشیرزنوں میں سے کوئی بھی اسکور کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے تو مقابلہ برابری پر ختم نہیں ہوتا بلکہ دونوں کھلاڑیوں کو شکست خوردہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لئے کھلاڑی پر یہ لازم ہے کہ وہ شمشیرزنی کے ستر فیصد مقابلے جیتے تب ہی اس کو کامیاب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کامیابی کی صورت میں شمشیرزن کو (1000) پوائنٹس ملتے ہیں۔

تیراکی :

گھڑسواری، شمشیرزنی اور نشانہ بازی کے مقابلوں میں حصہ لینے کے بعد کھلاڑی تیراکی کے مقابلے میں شریک ہوتا ہے۔ جوکہ جدید پینٹاتھلون کا چوتھا مقابلہ ہے۔ کھلاڑی کے تیرنے کے لئے کوئی مخصوص اسٹروک نہیں ہوتا۔ یہ مقابلہ فری اسٹائل تیراکی میں ہوتا ہے۔ کھلاڑی کو تین سو میٹرز کا فاصلہ تین منٹ اور 54 سیکنڈ میں طے کرنا ہوتا ہے۔ جس پر اسے (1000) پوائنٹس ملتے ہیں اگر مقررہ جگہ پر پہنچنے میں آدھا سیکنڈ بھی تاخیر ہوجائے تو کھلاڑی کے چار پوائنٹس کم کرلئے جاتے ہیں اور اگر کھلاڑی آدھا سیکنڈ پہلے پہنچ جائے تو چار اضافی پوائنٹس کھلاڑی کے اسکور میں شامل کردیئے جاتے ہیں۔

کراس کنٹری دوڑ :

پینٹاتھلون کا آخری ایونٹ ہے جو کھلاڑی کے لئے آخری امتحان ہوتا ہے۔ اس سے پہلے چار مختلف کھیلوں میں حصہ لینے کے بعد کھلاڑی کافی تھک چکا ہوتا ہے لیکن اس کی کوشش ہوتی ہے کہ یہاں بھی وہ دیگر کھیلوں کی طرح مقررہ فاصلہ 14 منٹ اور 15 سیکنڈ میں طے کرے تاکہ اس کے اسکور میں مزید(1000) پوائنٹس کا اضافہ

کیا جاسکے۔ ان پانچوں کھیلوں کے قوانین وہی ہوتے ہیں۔ جو انفرادی طور پر ہم دیگر کھیلوں میں دیکھتے ہیں۔ جدید پینٹاتھلون کے مقابلوں نے اولمپک کھیلوں میں شمولیت کے بعد جلد ہی عالمی سطح پر اپنی مقبولیت منوالی تھی لیکن ایک بین الاقوامی سطح کی پینٹاتھلون کی تنظیم کی تشکیل خاصی تاخیر سے ہوئی۔ ساتویں جدید اولمپکس اگست سنہ 1948ء کو برطانیہ کے شہر سینڈ ہرسٹ میں جدید پینٹاتھلون کی عالمی فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ سنہ 1960ء کے روم اولمپیاڈ کے موقع پر ایک اور اجتماعی کھیل (جس کا تعلق موسم سرما کے اولمپکس سے ہے) بائتھلون کو بھی اس فیڈریشن کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس طرح یہ دو اجتماعی کھیلوں (جدید پینٹاتھلون اور بائتھلون) کی مشترکہ تنظیم، "یونین انٹرنیشنل ڈی پینٹاتھلون ماڈرن ایٹ ڈی بائتھلون" (یو آئی پی ایم بی) کہلاتی ہے۔ جدید پینٹاتھلون کی عالمی چیمپئن شپ کا آغاز سنہ 1949ء میں ہوا۔ یہ ہر سال باقاعدگی سے منعقد ہوتی ہے۔ جدید پینٹاتھلون میں خواتین کی عالمی چیمپئن شپ سنہ 1981ء میں شروع ہوئی۔ یاد رہے اولمپکس میں خواتین کے جدید پینٹاتھلون کے مقابلے شامل نہیں ہیں۔

●●●

مقابلوں کی معلومات

شیخ محمد عاکف، کامونکے

اولمپک مقابلے 394 قبل مسیح میں شروع ہوئے۔

قدیم اولمپک مقابلوں کا پہلا چیمپئن کوربیس تھا۔

اس زمانے میں اولمپک مقابلے 5 دن تک جاری رہتے تھے۔ جدید اولمپک مقابلوں کا بانی فرانس کا ماہر تعلیم بیرن پیٹروے کوبرٹن تھا۔

جدید اولمپک مقابلے سنہ 1896ء میں شروع ہوئے، سنہ 1896ء میں صرف 12 ممالک نے ان مقابلوں میں حصہ لیا۔

اولمپک مقابلوں میں پہلی بار خواتین نے سنہ 1900ء کے فرانس اولمپک میں شرکت کی۔ ان کھیلوں میں گیارہ خواتین نے حصہ لیا۔

ایشیا میں سب سے پہلے اولمپک مقابلے جاپان کے شہر ٹوکیو میں سنہ 1964ء میں کھیلے گئے جس میں کل 93 ممالک کی ٹیموں نے شرکت کی تھی۔

روزنامہ جنگ کراچی

پیر 27 رجب المرجب 1417ھ 9 دسمبر 1996ء

زائر میں بچوں کی فوج نے قصبے پر قبضہ کرلیا

کنشاسا (ٹی وی رپورٹ) مشرقی زائر میں حکومت کے خلاف بغاوت کرنے والوں میں شامل بچوں کی فوج کے ایک دستے نے بغیر کسی مدد کے ایک ہزار آبادی والی ایک قصبے پر قبضہ کرلیا ان بچوں کی عمریں 6 سال سے 12 سال کے درمیان ہیں۔

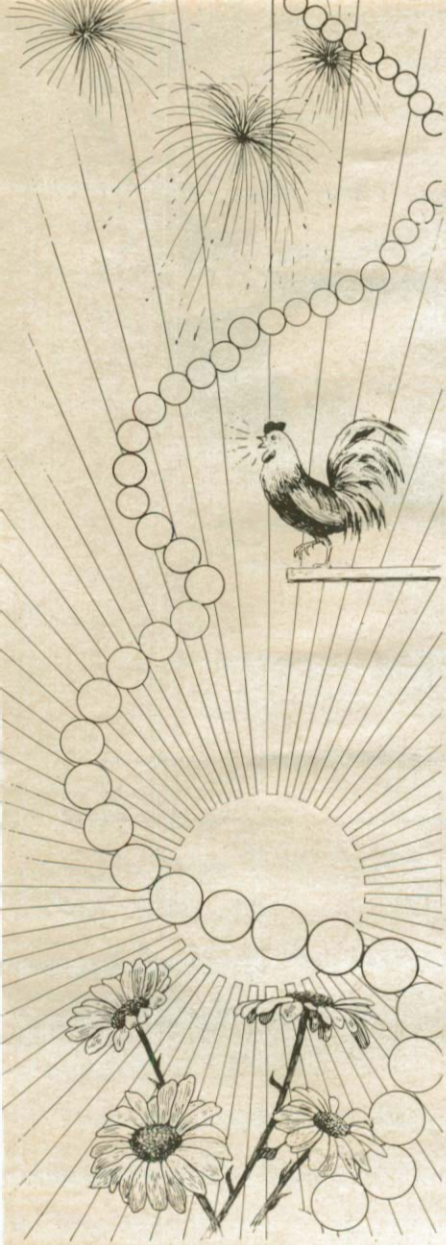

نیا سال

ضیغم جمیل دی

لے کر نئی امید، پھر آیا ہے نیا سال
اللہ رکھے سب کو نئے سال میں خوشحال

ہر پل ہے نیا پل، سبھی لمحات نئے ہیں
ہر دھن ہے نئی دھن، سبھی نغمات نئے ہیں

پھولوں میں ہے موجود جو مہکار نئی ہے
بدلے ہوئے حالات کی رفتار نئی ہے

سینوں میں مچلتے ہوئے جذبات نئے ہیں
موسم ہے نیا اور یہ دن رات نئے ہیں

سوچا بھی کبھی تم نے کہ ہم کیوں ہوئے پامال
ہر سال کئے ہم نے ہمیشہ برے اعمال

جو ہم نے کیا عہد، ہمیں راس نہ آیا
اچھائی کا ہر عہد ہر اک سال بھلایا

ہم پھر یہ کریں عہد کہ ہم نیک بنیں گے
ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں، ہم ایک رہیں گے

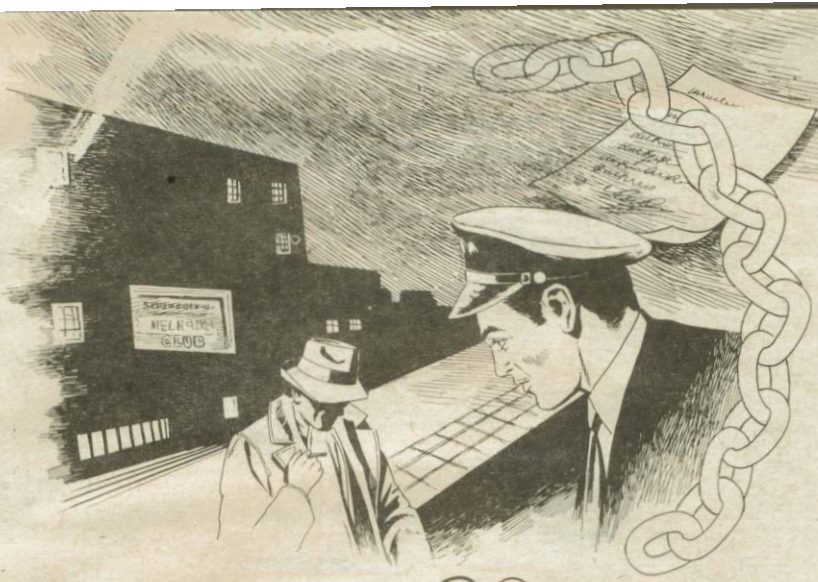

20 سال بعد

سیما صدیقی

ایک ایسی کہانی جس کی آخری سطریں پڑھنے سے پہلے یقین نہیں آتا کہ یہ کہانی ایک غیر محسوس مقابلے کی ہے

پولیس مین ایک کشادہ بازار میں نہایت مستعدی سے گشت کر رہا تھا۔ اس وقت بہ مشکل دس بجے تھے۔ سرد طوفانی جھکڑوں کے ساتھ بارش کے آثار بھی محسوس ہو رہے تھے۔ چنانچہ سڑکیں لوگوں سے تقریباً" خالی ہو چکی تھیں۔

پولیس مین نے اپنی چھڑی کو نہایت فنکاری اور چابکدستی سے کئی بار تیزی سے گھمایا۔ اس پُرامن شاہراہ پر ایک بھرپور نگاہ دوڑائی۔ وہ ایک دراز قد اور پُرعزم شخص تھا۔ پولیس افسروں کا مخصوص رعب اور قدرے تحکمانہ انداز اس کی شخصیت کا خاصہ تھا مگر اس کے باوجود شائستگی اور امن پسندی کی ایک عمدہ تصویر نظر آ رہا تھا۔ سگار کی دکان اور ریسٹورنٹ میں حسب معمول روشنی نظر آ رہی تھی۔ لیکن بازار کے اکثر کاروباری علاقے کافی دیر قبل بند ہو چکے تھے۔

پولیس مین اپنا آدھا گشت تقریباً" مکمل

کر چکا تھا اور قدرے مطمئن نظر آرہا تھا۔ دفعتاً" اس کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ ایک شخص لکڑی کے سامان کی دوکان کے دروازے کے نزدیک گوشے میں کھڑا تھا۔ ان جلا سگار اس کے منہ میں دبا ہوا تھا جونہی پولیس مین اس شخص کے نزدیک پہنچا۔ اس نے بڑی تیزی سے کہا "سب ٹھیک ہے آفیسر" اس کے لہجے میں اعتماد تھا" میں صرف انتظار کر رہا ہوں ..... ایک دوست کا جس سے میں نے بیس سال قبل ملاقات کا وقت طے کیا تھا۔"

"تم کافی دلچسپ آدمی لگ رہے ہو؟" پولیس مین نے کہا۔

"اچھا' اگر تم پسند کرو' تو میں تمہارے اطمینان کے لئے حقیقت حال کی وضاحت ضرور کروں گا۔ بہت پہلے کا ذکر ہے' اس وقت ہم جہاں کھڑے ہیں وہاں ایک ریسٹورنٹ ہوا کرتا تھا' بگ جیور' بریڈی' ریسٹورنٹ۔" اجنبی شخص نے کہنا شروع کیا۔

"اب سے کوئی پانچ سال قبل ....." پولیس مین نے کہا "اب وہ ختم ہو چکا ہے۔" اس شخص نے ماچس سے سگار سلگایا۔ اس کی روشنی میں ایک لمحے کو اس کا بھاری جبڑے والا چہرہ' تیز عقابی نگاہیں اور دائیں ابرو کے نزدیک زخم کا چھوٹا سا نشان نمایاں ہو گیا۔ اس کے اسکارف پر بطور پن ایک بڑا سا ہیرا لگا ہوا تھا۔

"بیس سال پہلے کی رات ..... میں نے یہیں' جمی ویلز' کے ساتھ رات کا کھانا کھایا تھا' جو میرا بہت گہرا دوست' ہمدم اور رفیق تھا اور اس دنیا کا سب سے بہترین انسان تھا۔ میں اور وہ "نیویارک" میں پلے بڑھے۔ بالکل ایسے جیسے کہ دو بھائی ایک ساتھ پرورش پاتے ہیں۔ میں اٹھارہ سال کا تھا اور جمی بیس سال کا۔ اس سے اگلی صبح مجھے اپنی قسمت آزمائی کے لئے مغرب کی جانب سفر کرنا تھا۔ لیکن میں جمی کو نیویارک سے نکلنے پر آمادہ نہ کر پایا۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ اس کرۂ ارض پر جو کچھ ہے وہ نیویارک ہی ہے۔ بہرحال! ہم نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ہم ٹھیک بیس سال بعد' اسی مقام پر' اسی تاریخ کو اور اسی وقت دوبارہ ملیں گے۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس وقت ہمارے حالات کیا ہوں گے۔ ہمارے درمیان کتنا فاصلہ ہو گا۔ ہم آنا چاہیں گے بھی یا نہیں۔ ان بیس سالوں نے ہم پر کیا نقش ثبت کئے ہوں۔ ہمارے مقدر نے یاوری کی ہو یا نہیں۔ ہمارے نصیب سنورے ہوں یا نہیں ..... بہرحال جو کچھ بھی ہو ہمیں یہاں ہرحال میں آنا تھا۔"

"یہ داستان تو بڑی خوبصورت اور دلچسپ ہے۔" پولیس آفیسر نے کہا۔ "تمہاری سرشاری کی کیفیت کو میں بہ خوبی محسوس کر سکتا ہوں۔ تو پھر جب تک تمہارے دوست کی جانب سے کوئی اطلاع نہیں مل جاتی۔ تم یہاں سے نہیں جاؤ گے؟"

"ہاں! جیسی بھی صورت حال ہوگی دیکھا جائے گا۔ لیکن اگر آج ہم نہ ملے تو شاید ہم ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائیں گے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جمی مجھ سے ضرور ملے گا۔ اگر وہ زندہ ہے کیونکہ وہ ہمیشہ سے دنیا میں اصول پسندی اور سچائی کا چیمپئن رہا ہے۔ وہ کبھی نہیں بھولے گا اور میں بھی جو سینکڑوں میل دور سے چل کر آیا ہوں اور اتنی رات کو اس دروازے پر کھڑا اس کی راہ تک رہا ہوں۔ یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہوگا کہ میرا پرانا ساتھی لوٹ آئے۔"

منتظر شخص نے اپنی گھڑی نکالی۔ اس کے ڈھکن پر چھوٹے چھوٹے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ "دس بجنے میں تین منٹ!" اس نے گویا اعلان کیا۔ "اس وقت بھی ٹھیک دس بجے تھے جب اسی ریسٹورنٹ کے دروازے پر ہم ایک دوسرے سے جدا ہوگئے تھے۔"

"کیا تمہیں یقین نہیں کہ مغرب سے باہر بھی خوبصورت مستقبل کے حصول کے مواقع موجود ہیں؟" پولیس مین نے پوچھا۔ "شرط لگالو! پھر بھی مجھے امید ہے جمی میرے مقابلے میں کم از کم نصف خوشحال ضرور ہوگیا ہوگا۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو سست لیکن محنتی ہوتے ہیں۔ وہ میرا بہترین ساتھی تھا۔ مغرب میں میرا مقابلہ ان لوگوں سے تھا جو بڑے چلتر تھے، انتہائی تیز اور کائیاں! لیکن میں ان کے سامنے ذرا بدحواس نہ ہوا اور میں نے خوب دولت کمائی۔ مغرب میں اپنی جگہ بنانا بہت مشکل کام ہے۔ یہ تیسری طراری مغرب کی ہی مرہونِ منت ہے۔"

پولیس آفیسر نے چھڑی کو انگلیوں پر گھمایا اور ایک قدم آگے بڑھا کر بولا۔ "اب میں چلوں گا! مجھے امید ہے تمہارا دوست مکمل طور پر خیریت سے ہوگا۔ بشرط یہ کہ وہ بھی چلتر نہ کہا جانے لگا ہو۔"

"میں ایسا نہیں کہہ سکتا!" اس شخص نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ "میں کم از کم آدھا گھنٹہ مزید اس کا انتظار کروں گا۔ اگر جمی زندہ ہے تو وہ اس وقت یہاں ضرور پہنچے گا۔"

اس اثناء میں اچھی خاصی ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی اور طوفانی ہواؤں کے جھکڑ مزید تیز ہوگئے۔ پیدل چلنے والے اِکّادکّا راہ گیروں نے

پریشان ہو کر جلدی جلدی کوٹ کے کالر اوپر کی جانب کھڑے کرلئے اور ہاتھوں کو جیبوں میں ڈال لیا۔ لکڑی کے سامان والی دوکان کے دروازے پر کھڑا شخص طے شدہ ملاقات کی خاطر سینکڑوں میل لمبی مسافت طے کر کے پہنچا تھا۔ یہ بات تقریباً غیر یقینی اور بے سروپا لگ رہی تھی کہ اس ڈرامائی انداز میں دورِ جوانی کے دوستوں کا ملنا! اس شخص نے سگار سلگایا اور انتظار کرنے لگا۔

گلی کی مخالف سمت سے ایک شخص تیزی سے سڑک پار کر کے آیا اور سیدھا اس منتظر شخص کے پاس پہنچا۔ "یہ تم ہو! بوب؟" اس نے غیر یقینی انداز میں پوچھا۔ دروازے پر کھڑے شخص نے چلا کر کہا "یہ تم ہو، جمی ویلز؟" نووارد نے کچھ دعائیہ کلمات کہے۔ منتظر شخص نے نووارد کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لئے۔ "میں بوب ہوں! یہ اسی طرح یقینی بات ہے، جیسے تقدیر ایک اٹل حقیقت ہے..... مجھے یقین تھا کہ میں تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ تمہیں یہاں ضرور پاؤں گا۔ اگر تم زندہ ہو۔" "خوب، بہت خوب! بیس سال ایک طویل مدت ہوتی ہے۔ پرانا ریسٹورنٹ ختم ہوگیا۔ بوب! میری خواہش ہے کہ کاش یہ موجود ہوتا۔ تو ہم یہاں ایک ڈنر کرتے۔ تم سناؤ، مغرب نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

"اس نے مجھے سب کچھ دیا جو کچھ میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تم بہت زیادہ بدل گئے ہو جمی! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارے قدوقامت میں مزید دو تین انچ کا اضافہ ہوجائے گا۔"

"اوہ! ہاں اس وقت میں بیس سال کا تھا اس کے بعد بھی بتدریج میرے قد میں بڑھت ہوئی ہے۔"

"تم نیویارک میں اچھے تو رہے جمی؟"

"ہاں کسی حد تک شہری حلقوں میں، میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہوں۔ چھوڑو بوب! آؤ ہم اس جگہ کا چکر لگائیں اور گئے وقتوں کی یادیں تازہ کریں۔"

"بازو میں بازو ڈال کر دونوں نے سڑک پر چہل قدمی شروع کردی۔ مغرب سے تعلق رکھنے والے شخص کی خودپسندی اور انا پرستی اس کی کامرانیوں کے باعث بہت بڑھ چکی تھی تاہم دوسرا شخص اس کی گفتگو خاصی دلچسپی سے سُن رہا تھا نکڑ پر ایک میڈیکل اسٹور بجلی کے قمقموں کی روشنی سے منور نظر آرہا تھا۔ جب وہ دونوں اس گوشے تک پہنچے تو روشنی کے سبب

ان کی آنکھیں ذرا دیر کو چندھیا سی گئیں' دونوں بیک وقت پلٹے اور ایک دوسرے کے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ مغرب سے آیا ہوا آدمی یک لخت رک گیا اور اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس کے بازو سے چھڑالیا۔ "تم جمی نہیں ہو!" وہ پھنکارا' "بیس سال ایک طویل عرصہ ہے' لیکن یہ اتنا طویل عرصہ نہیں کہ ایک شخص کی اچھی بھلی ناک رومن کتے کی طرح چپٹی ہو جائے۔"

"اس عرصے میں ایک اچھا آدمی برا بن سکتا ہے تو....." نووارد نے بات ادھوری چھوڑ کر کہا "تم گزشتہ دس منٹ سے زیر حراست ہو۔ شکاگو پولیس کا خیال ہے کہ تم ان کے ہاتھوں سے نکل چکے ہو..... انہوں نے وائرلیس پر ہمیں اطلاع دی کہ وہ تم سے "پوچھ گچھ" کرنا چاہتے ہیں "خاموشی سے چلو! چل رہے ہو؟ سمجھ داری کا تقاضا یہی ہے۔ اس سے قبل کہ ہم پولیس اسٹیشن جائیں۔ ایک خط ہے کیا میں تمہیں دے سکتا ہوں؟ تم اسے پڑھنا چاہو تو کھڑکی کے پاس جاکر پڑھ لو..... یہ گشتی پولیس آفیسر جمی ویلز کی طرف سے ہے۔"

بوب نے اس کے ہاتھ سے کاغذ کا چھوٹا سا تہہ شدہ ٹکڑا لیا۔ جب اس نے خط پڑھنا شروع کیا تو اس کے ہاتھ میں کوئی لرزش نہیں تھی۔ لیکن جب اس نے خط ختم کیا تو اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ نوٹ کسی حد تک مختصر تھا۔

"بوب! میں نے اس وقت ملاقات طے کر رکھی تھی۔ جب تم نے ماچس سے اپنا سگار سلگایا' تمہارے سگار کی روشنی میں' میں نے دیکھا کہ یہ اس آدمی کا چہرہ ہے جو شکاگو پولیس کو مطلوب ہے۔ جو کچھ بھی ہوا یہ میں بذات خود کرنے کی ہمت نہ کرسکا۔ چنانچہ میں تم سے مل کر اور ایک چکر لگا کر چلا گیا اور یہ کام کرنے کے لئے ایک سادہ لباس پولیس آفیسر کو بھیجا۔

گشتی پولیس آفیسر' جمی ویلز

●●●

مقابلے کا ایک انداز

پیدل مقابلے

ظفر اقبال

پیدل چلنا بھی ایک کھیل ہے اور یہ کھیل سنہ 1589ء سے کھیلا جارہا ہے۔ سنہ 1906ء میں یہ کھیل اولمپک میں شامل کرلیا گیا۔ واکنگ کے نام سے دنیا بھر میں میلوں لمبے مقابلے ہوتے ہیں۔ اس میں بھی دوسرے کھیلوں کی طرح ریکارڈ بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ اس میں چیمپئن بھی بنتے ہیں۔ پیدل چلنے والے کھلاڑیوں کو واکر کہتے ہیں۔

تین طلائی تمغے جیتنے والا واحد کھلاڑی

دنیا کے واحد واکر جنھوں نے تین طلائی تمغے جیتے، اٹلی کے یوگو فریگیریو (پیدائش 1901ء- انتقال 1968ء) تھے جنھوں نے سنہ 1920ء میں تین ہزار میٹر پیدل چل کر طلائی تمغہ جیتا۔ اسی سال دس ہزار میٹر پیدل چلنے کے بعد دوسرا طلائی تمغہ جیتا۔ اس طرح انہیں سب سے زیادہ طلائی

سب سے طویل اولمپک مقابلے سنہ 1900ء میں پیرس میں ہوئے تھے جو تقریباً" پانچ مہینے آٹھ دن تک جاری رہے۔ سب سے کم دورانیہ کے اولمپک مقابلے سنہ 1874ء میں ایتھنز میں ہوئے جو صرف دس دن تک جاری رہے۔

تمغے جیتنے کا اعزاز حاصل ہے۔

ایک گھنٹے میں زیادہ سے زیادہ چلنا :

ایک گھنٹے میں سب سے زیادہ فاصلہ میکسیکو کے ڈینٹیل نے طے کیا۔ وہ 27 مارچ سنہ 1980ء کو ایک گھنٹے میں 9 میل 696 گز تک پیدل چلے۔

چوبیس گھنٹے میں زیادہ سے زیادہ چلنا :

برطانیہ کے ہونیلسن نے سرے کے مقام پر 14 اور 15 اکتوبر 1960ء کو 24 گھنٹے مسلسل پیدل چل کر 133 میل 21 گز کا فاصلہ طے کیا۔

خواتین بھی پیچھے نہیں، وہ بھی 24 گھنٹے مسلسل چل کر ریکارڈ قائم کر چکی ہیں۔ برطانیہ کی این سائر نے 4 اور 5 مئی سنہ 1980ء کو فرانس کے شہر ٹور ڈی میں 118 میل پیدل چل کر ریکارڈ قائم کیا۔

ایک منٹ کے لئے رکے بغیر چلنا :

دنیا میں ایسے لوگ بھی گذرے ہیں جنہوں نے ایک منٹ کے لئے رکے بغیر واکنگ کی ہے۔ ایڈورڈ جارج فریڈ 13 سے 19 ستمبر سنہ 1980 تک مسلسل 152 گھنٹے چالیس منٹ پیدل چلتے رہے۔ انہوں نے تقریباً" ساڑھے تین سو میل کا فاصلہ طے کیا۔ راستے میں انہیں کہیں آرام کرنے نہیں دیا گیا۔

الٹے پاؤں چلنے والے :

الٹے پاؤں چلنے کے ہیرو ٹیکساس کے پٹی ایل ونگورے ہیں جنہوں نے 15 اپریل سنہ 1931ء کو دو براعظموں کے درمیان آٹھ ہزار میل کے فاصلے پر الٹا چلنا شروع کیا اور 24 اکتوبر سنہ کو استنبول (ترکی) اپنی منزل پر پہنچے۔

24 گھنٹوں میں الٹے پاؤں پیدل چلنا :

ارجنٹائن کے ٹامس کالوس پریرا کے سر پر پیدل چلنے کی ایسی دھن سوار ہوئی کہ وہ 6 اپریل سنہ 1968ء سے 8 اپریل 1978ء تک پیدل چلتے رہے۔ اس دوران انہوں نے 29 ہزار 825 میل کا سفر طے کیا اور تمام براعظموں کی سیر کی۔

●●●

"اکیسویں صدی کے سپیرے"

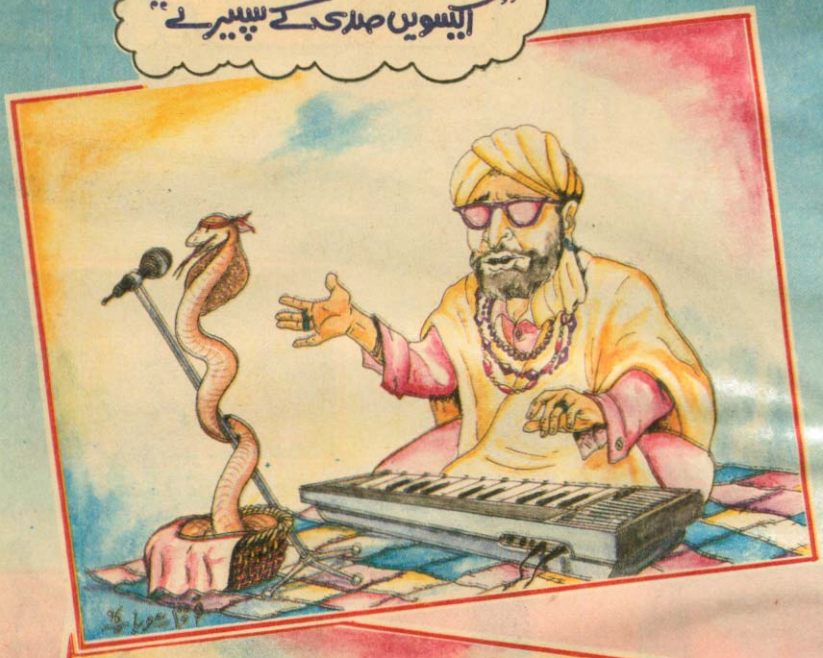

"بے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار
جستجو جو کرے وہ چھوئے آسماں"

اعزاز کے دفاع کا
عجیب و غریب مقابلہ

ڈویل

یقینی موت سے عبارت تاریخ انسانی کے حیرت انگیز مقابلے

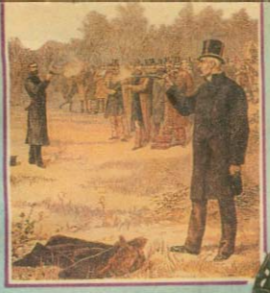

کون مرا؟ کون بچا؟

ڈویل کا مخصوص پستول

ایک دو تین ۔ وہ لو چل گئی مشین

تلواروں کے کھیل میں دیکھو
جب تک اک کی جان نہ جائے
تب تک دُوجا چین نہ پائے

"ڈویل" لڑنے کی
خون میں نہائی
مخصوص تلواریں

اسامہ بن سلیم

ڈوئل

اعزاز کے دفاع کا عجیب و غریب مقابلہ

اسامہ بن سلیم

انسانی تاریخ لڑائیوں سے، جھگڑوں اور جنگوں سے بھری پڑی ہے۔ ان میں بیشتر لڑائیاں، ضد، ہٹ دھرمی اور انا کی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ ایسی ہی ایک لڑائی کا نام "ڈویل" ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپ اور امریکہ میں اس لڑائی کو مقبولیت حاصل رہی۔ اسے "اعزاز کے دفاع کی لڑائی" بھی کہا جاتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی شخص یہ محسوس کرتا کہ فریقِ ثانی کی طرف سے اس کی شان میں گستاخی کی گئی ہے تو وہ فوراً ہی اپنی انا کی حفاظت کی خاطر ڈویل لڑنے کا چیلنج کردیتا۔ یوں اس لڑائی میں جب تک ایک کی جان نہ چلی جاتی اس وقت تک دوسرے کی انا چین نہ پاتی۔

باوجود یہ کہ یہ مقابلہ ایک عرصہ تک غیر قانونی قرار دیا جاتا رہا لیکن اس کے باوجود آرمی کے افسران اور اس دور کے معززین میں بہت مقبول رہا۔

ڈویل کے مقابلے، تلواروں سے، نیزہ نما تلواروں سے، خنجروں سے اور بعد ازاں پستول سے بھی ہوا کرتے تھے۔ ڈویل لڑنے کے لئے بہ طور خاص علیحدہ قسم کی تلواریں بنائی جاتی تھیں۔ اسی طرح نشانے پر ٹھیک ٹھیک فائر کرنے والے پستول بھی ڈویل کے لئے بڑے اہتمام سے تیار کئے جاتے تھے۔ لڑائی کا ایک ہتھیار "Rapier" بھی کہلاتا تھا۔

ڈویل لڑنے کے لئے کچھ اصول بھی وضع کئے گئے تھے۔ اس لڑائی میں ان اصولوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوا کرتا تھا، لڑائی شروع ہونے سے قبل دونوں مدمقابل اور پھر ان کے دونوں ساتھیوں کے مابین اتفاق ہوتا۔ اس کے بعد ایک رومال گرایا جاتا اور اس کے گرتے ہی دونوں فریق اپنا بازو اٹھا کر ایک دوسرے پر فائر کردیتے۔ یوں پڑھے لکھے جاہلوں کی لڑائی میں کوئی ایک جاہل اپنی جان سے جاتا جبکہ دوسرے کی جھوٹی عزت معاشرے میں بحال ہوجاتی۔

لندن کا ایک میدان "نوتھل فیلڈ" ایک زمانے تک ڈویل کی لڑائیوں کے لئے بہت مشہور رہا ہے۔

●●●

اولمپک مقابلوں کے

حیرت انگیز واقعات

شیخ ظل ھما حمید

سنہ ۱۹۸۴ء کے لاس اینجلس اولمپکس میں احمد نصر مصری صبا رفتار نامی گھوڑے پر سوار ہوا مگر دوسرے ہی جمپ میں زمین پر آرہا۔ تماشائی دم بخود تھے۔ احمد نصر گرد جھاڑتے ہوئے اٹھا اور دوبارہ سوار ہوا مگر گھوڑے نے پھر گرادیا۔ اب کے سوار ہونے میں نصر کو زیادہ وقت لگا تاہم اس نے ہمت نہ ہاری۔ آخر کار اس پُرعزم مصری نے چکر پورا کرلیا۔ حالانکہ اس دوران ایک بار پھر گھوڑے کی شوخی نے اسے زمین پر لڑھکادیا تھا۔ ہجوم نے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں اور نصر کے لئے نعرہ ہائے تحسین بلند کئے۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ مصری پینٹا تھلیٹ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے درد کمر میں مبتلا تھا۔

☆ --- ☆ --- ☆

سیول اولمپکس سنہ ۱۹۸۸ء میں پوسان کے مقام پر کشتیوں کی دوڑ کا مقابلہ ہو رہا تھا۔

اس وقت ۳۵ ناٹ کی رفتار سے ہوا چل رہی تھی۔ جو کشتیوں کو بار بار پٹخ رہی تھی۔ سنگاپور کی ٹیم کے دو کشتی ران جوزف جون اور شاہر کی موٹر کشتی اس دوران الٹ گئی اور انہوں نے بمشکل اس کے اوپر پناہ لی۔ کینیڈا کا لارنس لیمبوکس قریب ہی کشتی دوڑا رہا تھا وہ ان کی مدد کو پہنچا۔ اس نے جوزف کو بچالیا۔ جو اپنی وزنی سیلنگ جیکٹ میں طوفان کا سامنا کرتے ہوئے ادھ موا ہوچکا تھا۔ سنگاپور کی ٹیم کی مدد کرتے کرتے لیمبوکس کشتیوں کی دوڑ میں کہیں پیچھے رہ گیا۔

منصفین نے لیمبوکس کو دوسری پوزیشن کا مستحق ٹھہرایا۔ جس وقت وہ سنگاپوریوں کی مدد کو پہنچا اس وقت وہ اسی پوزیشن میں تھا۔ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی نے اس کی دلیری پر اسے خصوصی ایوارڈ سے نوازا۔

--- ☆ ---

مقابلہ نمبر ۲

مقابلہ شعر گوئی

مصرعِ طرح ہم دے رہے ہیں۔ اس پر گرہ آپ لگائیے

کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ سات مزاحیہ اشعار پر مشتمل غزل بلکہ ہزل ۱۵ یوم کے اندر ہمیں بھجوا دیجئے

تین قیمتی انعامات آپ کے منتظر ھیں

مصرع طرح :- "کھا کے گڑ سو جا خدا تیری نگہبانی کرے"

گرہ آپ لگائیے :- -

مقابلہ نمبر ۳

اپنی تصویر بنائیے

مقابلۂ حلیہ بگاڑ

آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنی تصویر بنائیے

پھر بنائی ہوئی تصویر اور ایک عدد اسٹوڈیو کی تصویر ایک ساتھ ارسال کیجئے۔

مقابلے کے ساتھ امی ابو کا تصدیقی خط بھی آنا چاہیئے کہ واقعی آپ نے اپنی تصویر آئینے کے سامنے بیٹھ کر بنائی ہے۔

آپ کے پاس صرف ۱۵ دن ہیں۔ دیر نہ کیجئے۔

آئینہ تلاش کیجئے !

تین بہترین انعام آپ کے منتظر ہیں

آنکھ مچولی
(مقابلہ نمبر)

میں شائع ہونے والے کسی بھی مقابلے میں شرکت کے لیے لازم ہے کہ آپ اس مقابلے کا کوپن ساتھ ضرور روانہ کریں اس کے بغیر مقابلے میں شرکت ممکن نہ ہوگی۔

آج کے چھوٹے چھوٹے مقابلے کل کے بڑے بڑے مقابلوں میں کامیابی کی نوید ہیں

مقابلہ نمبر ۱ — مقابلۂ سُوجھ بُوجھ

نام ________ عمر ________ کلاس ________

اسکول ________ پتہ ________

________ فون نمبر ________

مقابلہ نمبر ۲ — مقابلۂ شعر گوئی

نام ________ عمر ________ کلاس ________

اسکول ________ پتہ ________

________ فون نمبر ________

صاف اور خوشخط لکھیں مقابلہ نمبر لکھنا نہ بھولیں

مقابلہ نمبر ۳ — مقابلۂ حلیہ بگاڑ

نام ________ عمر ________ کلاس ________

اسکول ________ پتہ ________

________ فون نمبر ________

۱۵ جنوری ۹۷ء مقابلوں میں شرکت کی آخری تاریخ ہے

مقابلہ نمبر ۴ — قصہ کوئز

نام ________ عمر ________ کلاس ________

اسکول ________ پتہ ________

________ فون نمبر ________

پاکستان نمبر کے لیے اپنی تحریریں آپ فروری تک بھجوا سکتے ہیں

مقابلہ نمبر ۵ — مقابلہ ذہانت کا

نام ________ عمر ________ کلاس ________

اسکول ________ پتہ ________

________ فون نمبر ________

مقابلہ نمبر ۶ — مقابلہ کہانی، مضمون، نظم "پاکستان نمبر"

نام ________ عمر ________ کلاس ________

اسکول ________ پتہ ________

________ فون نمبر ________

اسی شمارے میں شامل مقابلے

۱: مقابلۂ سُوجھ بُوجھ
۲: مقابلۂ شعر گوئی
۳: مقابلۂ حلیہ بگاڑ
۴: قصہ کوئز
۵: مقابلۂ ذہانت کا
۶: مقابلۂ کہانی، مضمون، نظم "پاکستان نمبر"

محنت کی شان

عنایت علی خان

محنت نے کر دکھائی آساں ہر ایک مشکل
محنت سے ہر سفینہ پہنچا قریبِ ساحل
محنت دکھا رہی ہے ہر راہ رَو کو منزل
محنت سے سج رہی ہے انسانیت کی محفل
محنت کے اس جہاں میں جھنڈے گڑے ہوئے ہیں

محنت سے آرزو کی کھیتی ہری ہوئی ہے
محنت کے بل پہ سب کی روزی کھری ہوئی ہے
محنت کے دم سے حاصل ہر برتری ہوئی ہے
محنت بغیر کوئی صنعت گری ہوئی ہے؟
محنت کے اس جہاں میں جھنڈے گڑے ہوئے ہیں

افلاک تک بشر کو پہنچا چکی ہے محنت
پاتال تک کے منظر دکھلا چکی ہے محنت
تاجِ فضیلت اس کو پہنا چکی ہے محنت
دنیا سے اپنی عظمت منوا چکی ہے محنت
محنت کے اس جہاں میں جھنڈے گڑے ہوئے ہیں

محنت سے تم بھی بچو! منزل کو پاسکو گے
کشتی کو آرزو کی ساحل پہ لاسکو گے
دنیا پہ پھر سے اپنا سکہ جما سکو گے
ماضی کی شان پھر سے سب کو دکھا سکو گے
محنت کے اس جہاں میں جھنڈے گڑے ہوئے ہیں

جو محنتی ہیں ان کی تم آن بان دیکھو
کس طرح کر رہا ہے محنت کسان دیکھو
محنت سے پڑ گئی ہے مٹی میں جان دیکھو
سونا بنی ہے مٹی، اللہ کی شان دیکھو
محنت کے اس جہاں میں جھنڈے گڑے ہوئے ہیں

مقابلہ

کیسا بھی ہو اور

مقام کوئی بھی ہو

سچ سچ بتائیے

مقابلے میں شرکت سے قبل کیا آپ اپنی کامیابیوں کے لیے

اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں

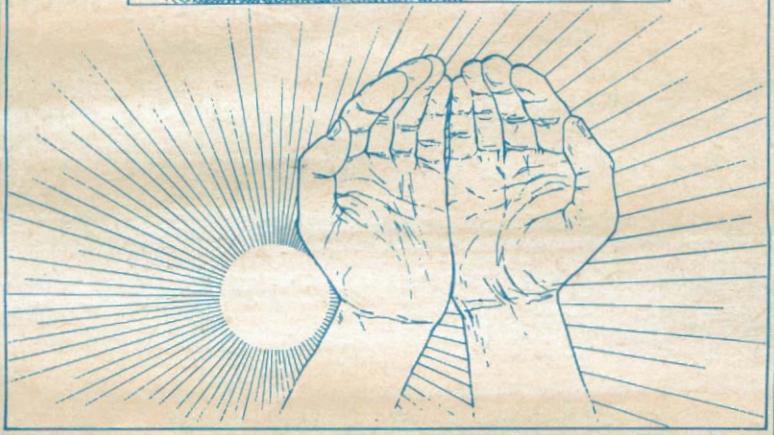

مقابلہ اور دعائیں

شیخ اے ایچ عابد۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہمیں بتاتی ہیں کہ اصل طاقت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر نہ تو کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے نہ فائدہ۔ ساری دنیا اگر آپ کی دشمن ہو جائے تو آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، اگر آپ کا رشتہ اپنے اللہ سے قائم ہے۔ اسی طرح ساری دنیا آپ کی حامی ہو جائے اور ایک اللہ کی ذات نہ چاہے تو وہ آپ کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفیقوں کو بہ کثرت دعائیں کرنے کی تعلیم دی ہے۔ خود حضورؐ بہ کثرت دعائیں مانگا کرتے تھے۔ خصوصاً" ایسے حالات میں جب کہ اسلام کے دشمنوں سے "مقابلہ" درپیش ہوتا۔ اس وقت تو حضورؐ کے اس معمول میں اور زیادہ شدت آجاتی۔ ہم ذیل میں چند ایسی دعائیں آپ کے مطالعے کے لئے پیش کر رہے ہیں جو حضورؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"تم میں سے کوئی شخص کوئی برا کام ہوتے دیکھے تو چاہیے کہ اسے ہاتھ سے بدل ڈالے، اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے منع کرے، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے (اسے برا جانے) اور یہ (دل سے برا محسوس کرکے رہ جانا) ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔" (مسلم)

اللہ تعالیٰ سے کیا کرتے تھے۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دشمن سے مقابلے میں مصروف ہوتے تو فرماتے،" "اے اللہ تو میرا معتمد علیہ ہے۔ تو ہی میرا مددگار ہے۔ میں تیری ہی قوت سے حملہ کرتا ہوں اور تیری ہی قوت سے لڑتا ہوں۔"

ابو موسیٰؓ کہتے ہیں "جب حضورؐ کو کسی قوم یا گروہ سے خوف و اندیشہ ہوتا تو یہ دعا مانگا کرتے۔" "اے اللہ ہم تجھے ان (اسلام کے دشمنوں) کے مقابلے میں لاتے ہیں اور ان کی شرانگیزیوں سے تیری پناہ کے طلب گار ہیں۔"

عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ کہتے ہیں "خندق کی لڑائی میں حضورؐ نے مقابلے کے وقت یہ دعا کی۔" "اے کتاب کو نازل کرنے والے اور جلد حساب لینے والے اللہ، کافروں کے گروہوں کو شکست دے۔ اے اللہ انہیں ناکامی سے دوچار کر اور ان کو جڑ سے ہلا ڈال۔"

عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے تھے۔" "اے اللہ میں تیرے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔ تجھ پر ایمان لاتا ہوں۔ تجھ پر توکل کرتا ہوں اور تیری ہی طرف رجوع کرتا ہوں اور تیری مدد ہی سے لڑتا ہوں اے اللہ میں تیری عزت و جلال کی پناہ میں آتا ہوں، تیرے سوا کوئی اللہ نہیں، الّا یہ کہ تو مجھے اس بات سے گمراہ کردے تو زندۂ جاوید ہستی ہے جب کہ جن و انس سب مرجائیں گے۔"

ابن عباسؓ کہتے ہیں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسے مواقع پر اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے۔" "اے میرے پروردگار! میری مدد کر اور میرے خلاف کسی کی مدد نہ کر، مجھے فتح عنایت کر اور مجھ پر کسی کو فتحیاب نہ کر، میرے لئے تدبیر کر اور میرے خلاف کسی کے حق میں تدبیر نہ کر۔ مجھے ہدایت بخش اور راہ راست پر چلنے کے لئے مجھے آسانیاں فراہم کر اور جس شخص نے مجھ پر زیادتی کی ہے اس کے خلاف میری مدد کر۔"

●●●

مقابلۂ سفر

عشرت رضیہ رضوی

ہزاروں نظریں اس کی منتظر تھیں۔ ہال میں موجود لوگ بے چینی سے گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک سات بجے اسٹیج سیکریٹری نے اس کی آمد کا اعلان کیا۔ اس کی جھلک پاتے ہی سب نے زبردست تالیوں اور پرجوش نعروں سے اس کا استقبال کیا۔

اس کا قد بہ بمشکل پانچ فٹ ہوگا، مگر ریڑھ کی ہڈی میں خم کی وجہ سے محض ساڑھے چار فٹ رہ گیا تھا۔ چھوٹے قد، سیاہ رنگت، پیٹھ کے ابھار کے دائیں ٹانگ میں لنگ نے اس کی ہیئت کو مضحکہ خیز بنا ڈالا تھا۔ مگر اس وقت لوگوں کی نظروں میں اس کی شکل و صورت اور ہیئت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اہمیت تو اس کے کارنامے کی تھی جس نے ملک کا اور خود اس کا نام ساری دنیا میں روشن کردیا تھا۔

اس کی پیش کردہ تھیوری کی وجہ سے اسے

دنیائے سائنس کے کئی بڑے اعزازات سے نوازا جاچکا تھا اور یہ سلسلہ ابھی جاری تھا۔ آج کی تقریب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ بلاشبہ وہ اس وقت ملک کا سب سے بڑا سائنس دان تھا۔

ہال "ڈاکٹر علیم ..... زندہ باد" کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ جب کئی منٹ گزر جانے کے باوجود نعروں اور تالیوں کا شور کم نہ ہوا، تو وہ خود ڈائس پر آیا اور لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔

اس نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔ وہ سب خاموشی سے اپنی نشستوں پر بیٹھے اس کی آواز سننے کے منتظر تھے۔

"آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔" اس نے بولنا شروع کیا۔ "میں اس وقت جو کچھ بھی ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے کرم اور آپ سب کی محبت کی وجہ سے ہوں۔ مگر آج بھی میں اپنے بچپن کا وہ دور نہیں بھلا سکتا جب میں احساس کمتری کا مارا ہوا ایک عام سا لڑکا تھا۔ پھر اچانک ایک مقابلے نے میری زندگی بدل ڈالی۔"

وہ چند لمحے سانس لینے کو رکا اور پھر لوگوں کے تجسس کو محسوس کرتے ہوئے یوں مخاطب ہوا۔

"بچپن میں مجھے اپنی جسمانی کوتاہیوں کا شدت سے احساس تھا۔ اسکول میں لڑکے میرے اوپر پھبتیاں کستے اور میرا مذاق اڑاتے۔ اگر ماں باپ کے حکم کا پاس نہ ہوتا، تو شاید میں بچپن میں ہی اسکول جانا ترک کرچکا ہوتا۔

مجھے اپنی کمزوری کا احساس اتنی شدت سے تھا کہ میرا دھیان کبھی اپنی خوبیوں کی طرف نہیں گیا۔ مجھے کبھی اس بات کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ باقی تمام مضامین میں کم نمبر لینے کے باوجود، سائنس اور حساب کے مضامین میں، میں جماعت میں سب سے زیادہ نمبر لیتا تھا۔ سائنس کے استاد کلاس میں جو کچھ پڑھاتے وہ میں دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں بہت جلد سمجھ لیتا اور اکثر ایسے سوالات کر ڈالتا جن کا جواب دینے سے پہلے سر کو بھی کافی سوچنا پڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے سائنس کے استاد سر حامد مجھے دوسرے طلباء کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ مگر میں ان کی توجہ اور پسندیدگی کو محض ہمدردی سمجھتا رہا۔

لوگوں کے رویئے کی وجہ سے میں بہت کم گھر سے باہر نکلتا تھا۔ اسکول سے واپس آکر میں زیادہ تر وقت گھر کے پچھواڑے میں موجود اپنی خود ساختہ لیبارٹری میں گزارتا۔ مجھے تجربات کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اسکول میں

سائنس کا جو بھی سبق پڑھایا جاتا' میں اس کا تجربہ خود اپنی لیبارٹری میں کرکے دیکھتا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے بنیادی سائنسی اصولوں کو سمجھنے میں کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کے باوجود میں نے جماعت میں کوئی نمایاں پوزیشن حاصل نہیں کی تھی۔ کیونکہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا۔

وقت گزرتا گیا اور میں آٹھویں جماعت میں پہنچ گیا۔ وہ میری زندگی کا ایک اہم دن تھا جب مجھے میرے استاد حامد صاحب نے ایک ضروری بات کرنے کے لئے اپنے آفس بلایا۔

انہوں نے کہا۔ "بیٹے میں نے آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ شہر کے تمام اسکولوں کے درمیان سائنسی ایجادات کا مقابلہ منعقد کرایا جارہا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ہمارے اسکول کی طرف سے آپ اس میں حصہ لیں۔" اس پر میرا جواب تھا۔ "سر میں نے تو کبھی کسی مقابلے میں حصہ نہیں لیا۔"

مگر انہوں نے کہا کہ "میں جانتا ہوں لیکن اس مقابلے میں آپ حصہ لیں گے۔"

میں چند لمحے خاموش رہا۔ پھر نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔

"سر وہاں تو بہت سارے لوگ ہوں گے اور میں ....." اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔

سر حامد چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر دھیمے مگر پُراثر لہجے میں بولے۔

"علیم بیٹے! مجھے معلوم ہے کہ قدرت نے چند ایسی جسمانی خوبیاں' جو دوسروں کے پاس موجود ہیں' آپ کو عطا نہیں کی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کبھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔ اس نے آپ کو بھی چند ایسی خوبیاں عطا کر رکھی ہیں' جو آپ کے کسی ہم جماعت میں موجود نہیں ہیں۔"

میں نے بے یقینی کے عالم میں سر حامد کی طرف دیکھا۔ مگر انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"یہ الگ بات ہے کہ وہ خوبیاں جسمانی نہیں بلکہ ذہنی ہیں۔ اللہ نے آپ کو بے پناہ ذہانت اور تحقیق کی جستجو عطا کی ہے۔"

سر حامد نے رک کر میری طرف دیکھا اور بولے۔

"آپ کو معلوم ہے' جن لوگوں میں یہ خصوصیات موجود ہوتی ہیں' وہ بڑے ہو کر کیا بنتے ہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"بہت بڑے سائنس دان۔"

سر حامد کے لہجے میں نہ جانے کیا اثر تھا کہ میں نے فوراً ہی اس مقابلے میں حصہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے دن رات محنت کی اور چند ہی دنوں میں ایک ایسا آلہ بنا ڈالا جو زلزلے کے معمولی سے معمولی جھٹکے کو بھی محسوس کرلیتا اور گھر والوں کو فوراً خبردار کردیتا تھا۔ سر حامد نے ہر مرحلے پر میری پُوری پُوری مدد کی۔

آخر کار مقابلے کا دن آپہنچا۔

اسکول کے میدان میں بے شمار طلباء اپنی اختراع یا ایجادات کے ساتھ موجود تھے۔ میں بھی ایک کونے میں اپنی ایجاد کے ساتھ گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔ مجھے تمام لڑکوں کی نظریں اپنا مذاق اڑاتی محسوس ہو رہی تھیں۔

مقابلے کے مہمانِ خصوصی ملک کے مشہور و معروف سائنس دان تھے۔ وہ مختلف طلباء کی ایجادات کا جائزہ لیتے ہوئے آخر کار میرے پاس پہنچے۔ میری گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا۔ مگر یہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ انہوں نے میرے خد و خال پر کوئی تنقیدی نظر نہیں ڈالی بلکہ میری ایجاد کو بہت دلچسپی سے دیکھا اور اس کے متعلق مختلف قسم کے سوال پوچھے۔ ان کے رویے نے مجھے نیا حوصلہ دیا اور میں نے تمام سوالوں کے جواب نہایت اعتماد سے دیئے۔

آخر میں مقابلے کا نتیجہ سنانے کے لئے تمام طلباء کو ہال میں جمع کیا گیا۔ سب دم سادھے نتیجے کے منتظر تھے۔ آخر کار نتائج کا اعلان ہوا۔ میری ایجاد کو پہلا انعام ملا تھا۔ اس لئے نہیں کہ میری ایجاد سب سے بہتر تھی، بلکہ اس لئے کہ مجھے اس میں استعمال کئے گئے تمام سائنسی اصولوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل تھیں، جس کا اندازہ مہمانِ خصوصی کو مجھ سے سوال و جواب کے دوران ہوگیا تھا۔

مجھے انعام وصول کرنے کے لئے اسٹیج پر بلایا گیا تو سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ مہمانِ خصوصی نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور مجھے ٹرافی دی۔ ٹرافی وصول کرتے ہوئے میں نے مجمع کی طرف دیکھا۔ سب لوگ مجھے دیکھ رہے تھے مگر اس وقت مجھے کوئی نظر اپنا مذاق اڑاتی محسوس نہیں ہوئی۔

یہ مقابلہ میری زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس کے بعد میں نے تحقیق کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ میں نے دن رات محنت کی اور اپنے عزم کو پورا کر دکھایا۔ لیکن میرا سفر ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ تحقیق کا یہ سفر میں آخری دم تک جاری رکھوں گا۔"

ڈاکٹر علیم نے رک کر مجمع کی طرف دیکھا۔

لوگوں کی نظروں میں ان کے لئے عقیدت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے اپنی گفتگو ختم کرنے سے قبل کہا۔

"میں آخر میں آپ سب سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ہم علم کی روشنی سے اپنے باطن کو خوبصورت کرلیں تو یقین کیجئے کہ ظاہری بدصورتی بھی خوبصورتی میں بدل جاتی ہے۔"

اس جملے پر پورا حال تالیوں سے گونج اٹھا اور لوگ تعظیماً سیٹوں سے کھڑے ہوگئے۔

●●●

حوصلہ افزائی

مرسلہ.....

کامران حیدر

ڈاہرانوالہ

یہ بہت پرانی بات ہے کہ لندن کے ایک نوجوان کے دل میں ادیب بننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لیکن حالت یہ تھی کہ اس نوجوان کے پاس روٹی کے لئے بھی پیسے نہیں تھے۔ وہ چوہوں سے بھرے ہوئے ایک گودام میں بوتلوں پر لیبل لگانے کا کام کرتا اور ایک غلیظ کوٹھی میں رات بسر کرتا تھا۔ وہ شدید احساس کمتری کا شکار تھا۔ رسالے اس کی کہانیاں چھاپتے نہیں تھے، آخر ایک رسالے کے مُدیر کو اس کی کہانی پسند آگئی۔ اس نے نوجوان کی تعریف کی اور یہ کہانی اپنے رسالے میں شائع کردی۔ نوجوان کے جذبات کا یہ عالم تھا کہ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس معمولی سی حوصلہ افزائی نے اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ بعد میں یہ لڑکا بہت بڑا ادیب بنا۔ شاید آپ نے بھی اس لڑکے کا نام سنا ہو۔

یہ لڑکا عالمگیر شہرت کا مالک انگریزی زبان کا شہرہ آفاق ادیب "چارلس ڈکنز" تھا۔

مقابلہ ذہانت کا

منیر احمد فردوس

۱۔ کسی سائنسی میلے میں ایک نو عمر سائنس دان نے اپنے اسٹال پر ایک ایسی بوتل نمائش کے لئے پیش کی جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ "اس میں موجود محلول دنیا کی ہر شے کو چند لمحوں میں اپنے اندر حل کرلیتا ہے۔" لیکن چند ہی دنوں میں اسے اپنا یہ دعویٰ واپس لینا پڑا کیونکہ دوسرے سائنس دانوں بلکہ عام لوگوں نے بھی کسی تجزیئے اور تحقیق کے بغیر ہی اسے غلط ثابت کردیا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ لوگوں کو کیسے پتہ چلا کہ نو عمر سائنس دان جھوٹ کہہ رہا ہے؟

☆ --- ☆ --- ☆

۲۔ وہ کونسی چیز ہے جسے ہم تو دیکھ سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نہیں دیکھ سکتے؟

☆ --- ☆ --- ☆

۳۔ ایک تقریب میں وسیم نے ایک آدمی کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے دوست سے کہا کہ ان صاحب کا بیٹا میرے بیٹے کا چچا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ صاحب رشتے میں وسیم کے کیا لگتے ہیں؟

☆ --- ☆ --- ☆

۴۔ ایک سیاح دنیا کی سیر کرتے کرتے ایک ایسے ملک میں جا پہنچا جہاں کی ریت یہ تھی کہ ہر نووارد کو سرکاری اہل کار پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے جاتے اور بادشاہ اس سے ایسا سوال کرتا جس میں ذہانت کا دخل ہوتا تھا۔ اگر نووارد صحیح جواب دے دیتا تو سیاح کو سیر کی اجازت کے ساتھ ساتھ کھانا پینا بھی دیا جاتا اور اگر ناکام ہو جاتا تو اسے قید کر دیا جاتا۔ چنانچہ مذکورہ سیاح بھی بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔ بادشاہ نے سیاح کو اپنے ملک میں چلنے والے ایک جیسے نو سکے اور ایک ترازو دیا اور کہا "تمہیں دیئے جانے والے سکوں میں سے آٹھ سکے بالکل اصلی اور وزن میں برابر ہیں جبکہ نواں سکہ جعلی ہے اور اس کا وزن بھی دوسرے سکوں سے زیادہ ہے۔ صرف دو مرتبہ ترازو استعمال کر کے معلوم کرو کہ نو سکوں میں سے نقلی سکہ کونسا ہے؟"

بتایئے سیاح کون سا طریقہ اختیار کرے کہ جعلی سکے کی نشاندہی ٹھیک ہو جائے؟

☆ --- ☆ --- ☆

۵۔ کسی شخص کو اس کے مخالفین نے اغواء کر کے ایک وسیع کمرے میں قید کر دیا۔ اس کمرے کی بنیادیں ۲۰ فٹ گہری تھیں اور ان پر کنکریٹ کی مضبوط دیواریں تعمیر کی گئی تھیں۔ کسی بھی دیوار پر کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ صرف چھت کے عین وسط میں ہوا کی آمد و رفت کے لئے دو مربع فٹ کا ایک سوراخ چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ سوراخ مذکورہ شخص کے سر سے آٹھ فٹ اونچا تھا۔ کمرے میں ایسی کوئی چیز موجود نہ تھی جس کی مدد سے وہ اس سوراخ سے فرار ہو سکتا۔ صورتِ حال خاصی مایوس کن تھی۔ چنانچہ کچھ دن تو وہ اپنی حالت پر صبر شکر کر کے بیٹھا رہا لیکن آخر ایک دن اس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ سرنگ کھود کر کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا کمرے کے کچے فرش کو کھودنا شروع کر دیا۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس کی اسکیم کیا تھی؟

☆ --- ☆ --- ☆

۶۔ تنویر نے ایک درخت کے تنے پر زمین سے ایک میٹر کے فاصلے پر اپنا نام کندہ کیا۔ بتایئے اگر یہ درخت سال میں ڈیڑھ میٹر بڑھتا ہو تو دو سال

مینڈک کھانے کا عالمی ریکارڈ

اگست ۱۹۷۴ء میں آئرلینڈ کے جان میکنا مارا نے ۵ زندہ مینڈک ۶۵ سیکنڈ میں نگل کر عالمی ریکارڈ قائم کیا یہ مقابلہ پانچ ہزار افراد کی موجودگی میں سرانجام دیا گیا۔

بعد اس کا نام زمین سے کتنی بلندی پر ہو گا؟

☆ --- ☆ --- ☆

۷۔ گھڑیوں کے ایک دکاندار نے ۱۵ جون ۱۹۷۴ء کو دوپہر کے بارہ بجے اپنے شوکیس میں سجی ہوئی تین گھڑیوں کا وقت درست کیا۔ اگلے دن بارہ بجے پہلی گھڑی ایک منٹ آگے اور دوسری گھڑی ایک منٹ پیچھے تھی جبکہ تیسری گھڑی پر وقت بالکل درست تھا۔

بتایئے اگر ان گھڑیوں کو یونہی چلتا رہنے دیا جائے تو کس دن اور کس وقت تمام گھڑیاں ایک ہی ساتھ بارہ بجائیں گی؟

☆ --- ☆ --- ☆

۸۔ ایک ہوائی جہاز لاہور سے کراچی تک کا فاصلہ ۸۰ منٹ میں طے کرتا ہے۔ لیکن یہی جہاز جب کراچی سے لاہور آتا ہے تو اسے یہ فاصلے طے کرنے میں ایک گھنٹہ ۲۰ منٹ لگتے ہیں حالانکہ اس کی رفتار دونوں صورتوں میں برابر ہوتی ہے اور وہ ایک ہی راستے پر سفر کرتا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے؟

☆ --- ☆ --- ☆

۹۔ اشفاق صاحب کے ٹائی ریک میں ۱۷ نیلی، ۱۱ پیلی، ۹ سرخ، ۳۴ سبز اور ۲ جامنی رنگ کی ٹائیاں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی ہیں۔ ایک دن اشفاق صاحب اپنے بیٹے کے ساتھ کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ اچانک کمرے کا بلب فیوز ہو گیا۔ اشفاق صاحب کی خواہش ہے کہ ان کی اور ان کے بیٹے کی ٹائی کا رنگ ایک ہی ہو۔ سوچ کر بتایئے کہ اندھیرے میں ایک ہی رنگ کی دو ٹائیاں نکالنے کے لئے انہیں کم از کم کتنی ٹائیاں نکالنی ہوں گی؟

☆ --- ☆ --- ☆

۱۰۔ ایک روپے کے نوٹ کی پشت پر دس کا ہندسہ تلاش کیجئے۔ واضح رہے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ اس ہندسے کی تلاش کے لئے آپ کو پورا زور لگانا پڑے گا۔

حیرت انگیز

رسم ادائیگی

تبت کے شو قبائل میں شادی کی رسم کی ادائیگی کے لئے دولہا دلہن کو ایک پورا کیک کھانا پڑتا ہے اور یہ ضروری ہوتا ہے کہ یہ سارا کیک ختم کرلیا جائے۔ اگر دولہا دلہن میں کوئی بھی کیک کھانے میں ناکام رہے تو شادی اسی وقت ختم ہو جاتی ہے۔

کالا لباس

یونان کے ایک جزیرے کے لوگ ہر وقت کالا لباس پہنے رہتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً ۱۵۰ سال قبل ترکوں سے شکست کھائی تھی۔ اس وجہ سے آج تک کالا لباس پہن کر شکست کا سوگ مناتے ہیں۔

دنیا کی سب سے بڑی چھپکلی

دنیا کی سب سے بڑی چھپکلی کا نام فورڈ ڈریگون ہے اور انڈونیشیا میں پائی جاتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ ہرن اور ریچھ جیسے تیز رفتار جانوروں کا شکار کرتی ہے۔

برطانیہ کی بلی

برطانیہ میں ایک بلی نے چوہے کو پالا اور بڑا کیا یہ واقعہ سنہ ۱۹۱۶ء کا ہے یہ بلی فرانس پٹ کی تھی۔

عبدالقدیر فراز، شوہاز عیسیٰ، پنجگور

طاقت کا مقابلہ

عبدالقادر

سورج سے ایک روز یہ کہنے لگی ہوا
میرے مقابلے میں ہے تیری بساط کیا

تو گولا آگ کا ہے فضائے بسیط میں
چند ساعتیں فلک پہ رہا اور جا چھپا

فرماں روائی میری شب و روز ہے یہاں
طوفان ہوں میں اور کبھی باغ کی صبا

مجھ سے ہی لہلہاتی ہیں سرسبز ٹہنیاں
ہے میری دھیمی چال کا انداز دل ربا

بادل کا شامیانہ ہے میرے ہی دوش پر
بارش کی شکل میں جو برستا ہے جابجا

مجھ سے ہے اس جہان میں ہر سمت زندگی
میرے بنا زمین کی ہر چیز ہے فنا

طاقت میں میرا ثانی نہیں کوئی بھی یہاں
میرے مقابلے پہ بھلا کون آئے گا

سورج نے مسکرا کے کہا "میری بات سن"
کم مائیگی یہ تیری، حقیقت نہیں ذرا

میرا ہے کیا مقام، کروں تجھ سے بحث کیوں
مجھ سے مقابلہ ہے حماقت کی انتہا

درکار ہے ثبوت تو ہوجائے امتحاں
وہ دیکھ راستے پہ مسافر ہے جارہا

کمبل ہے اس کے جسم پہ، اس کو اتار دے
طاقت کا زعم ہے تو یہی کام کر دکھا

سورج کی بات سن کے ہوا تیز ہوگئی
حملہ بڑے ہی زور سے اس شخص پر کیا

جھونکے ہوا کے تیز مسافر کو جب لگے
کمبل کو اس نے جسم پہ اپنے دبا لیا

جوں جوں ہوا نے زور لگایا غریب پر
اتنا ہی اپنے تن پہ اسے بھینچتا رہا

آخر ہوا شکست سے دوچار ہوگئی
سورج کے آگے سر کو ندامت سے خم کیا

باقی تھا امتحان ابھی آفتاب کا
پھر تو کمال مہر درخشاں نے یوں کیا

حدّت بڑھا کے اپنی شعاعوں میں شمس نے
گرمی کا سخت وار مسافر پہ کردیا

گرمی نے اس غریب کو بے چین کردیا
کمبل اتار ڈالا جو اس کے بدن پہ تھا

خورشید کامران ہوا امتحان میں
طاقت کا یوں زمانے پہ سکہ بٹھا دیا

طاقت کی بات میں نہ مگر بھولے بات یہ
طاقت کا اصل مالک خالق تو ہے خدا

یہ ساری کائنات ہے پروردگار کی
تابع ہیں اس کے حکم کے سورج ہو یا ہوا

حق اسکواڈ کا

اخلاق احمد

چھٹی کی گھنٹی، بجتے ہی ہر جانب ہنگامہ برپا ہو گیا۔

بچے اپنے بستے سنبھالے، ایک دوسرے سے ٹکراتے، بھاگتے، دوڑتے باہر نکلنے لگے۔ وہ چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ شرارتیں کر رہے تھے۔

اسی ہجوم کے درمیان سے وہ چاروں ایک ایک کر کے باہر نکلے۔

شہریار، سرفراز، ضیاء اور شہزاد۔

"حق اسکواڈ" کے چار ارکان۔

بدی کے خلاف جنگ کرنے والے۔

سچائی کا اور حق کا ساتھ دینے والے۔

ان کے کارناموں کی شہرت پھیلتی جا رہی تھی۔ ان کا تذکرہ اردگرد کے اسکولوں میں بھی ہونے لگا تھا۔ چھوٹی کلاسوں کے طالب علم انہیں رشک سے دیکھتے تھے۔ اساتذہ انہیں ذرا زیادہ پیار کرتے تھے۔

بہت دنوں سے "حق اسکواڈ" خاموش بیٹھا تھا۔

کوئی کارنامہ، کوئی ایڈونچر بہت دنوں سے سامنے نہیں آیا تھا۔ کوئی مہم بہت دنوں سے سر نہیں کی گئی تھی۔ وہ مسلسل پڑھائی میں مصروف رہے تھے۔ پڑھائی میں اور اپنی اپنی خاص صلاحیتوں کو بہتر بنانے میں۔

شہریار..... جوڈو اور کراٹے میں مزید مہارت حاصل کرتا جارہا تھا۔

سرفراز..... باڈی بلڈنگ کے ذریعے جسم کو طاقتور اور توانا بنارہا تھا۔

ضیاء تیز..... بہت تیز دوڑنے کا ماہر ہوتا جارہا تھا۔

شہزاد..... بجلی اور لوہے کے آلات کھولنے اور جوڑنے میں مہارت حاصل کررہا تھا۔

آج بہت دنوں کے بعد "وہ حق اسکواڈ" کی صورت میں یکجا ہوئے تھے۔

شہریار نے انہیں بتایا تھا کہ آج اسکول کی چھٹی کے بعد "ہیڈ کوارٹر" میں میٹنگ ہوگی۔ کیوں ہوگی؟ یہ بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔

"ہیڈ کوارٹر" اس چھوٹے سے غار کا نام تھا جہاں ان چاروں نے "حق اسکواڈ" کی بنیاد رکھی تھی۔ اسکول سے کچھ فاصلے پر ایک ذرا سنسان سے پہاڑی علاقے میں یہ غار، ان کو اپنے گھر کی طرح عزیز تھا۔ انہوں نے اس کی صفائی ستھرائی کی تھی۔ یہاں دریاں بچھائی تھیں۔ چائے بنانے کا سامان رکھا تھا۔ یہاں وہ مل کر پڑھائی بھی کرتے تھے۔ اور ضرورت پڑنے پر "حق اسکواڈ" کے کارناموں کی منصوبہ بندی بھی کرتے تھے۔

"ہیڈ کوارٹر" پہنچتے ہی انہوں نے تیزی سے کام کرنا شروع کردیا۔

شہزاد، کیتلی میں پانی بھر کر لایا۔

شہریار نے چولہا جلا کر چائے بنائی۔

ضیاء نے پورے غار کی صفائی کی۔

سرفراز نے کچھ نہ کیا۔ کیونکہ اسے آخر میں برتن دھو کر رکھنے تھے۔

چائے پینے کے دوران سرفراز نے کہا۔ "بھائی شہریار۔ کیا چکر ہے؟"

"چکر!" شہریار نے حیرت سے پوچھا۔ "کیسا چکر؟"

"زیادہ معصوم نہ بنو۔" ضیاء نے کہا۔ "معصوم بن کر تم بالکل گینڈے لگتے ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ، ہمیں یہاں کیوں بلایا ہے؟"

"کس قدر احمقانہ بات کی ہے۔" شہریار نے افسوس سے سر ہلایا "لگتا ہے کہ تم نے زندگی میں کبھی کوئی گینڈا نہیں دیکھا۔" ضیاء نے جواب دیا۔ "مگر آج تمہیں دیکھ لیا ہے اور مجھے

پتہ چل گیا ہے کہ گینڈا کیسا ہوتا ہے۔" شہریار ہنسا اور بولا "اچھا اب بک بک بند کرو تو میں کچھ بتاؤں۔"

سب خاموش ہوگئے۔

شہریار نے مگ سے چائے کا گھونٹ لیا اور بولا۔ "ایک ہفتے بعد ہمارے اسکول کی ایک ٹیم میراتھن ریس کے فائنل مقابلے میں حصہ لینے والی ہے۔ تم لوگوں کو معلوم تو ہوگا۔؟"

"یہ میراتھن ریس کیا ہوتی ہے بھائی؟" سرفراز نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

"یہ بہت لمبی، بہت طویل دوڑ کو کہتے ہیں۔" شہریار نے کہا۔

"کتنی لمبی؟"

"عام طور پر تو یہ بیس اکیس میل کی دوڑ ہوتی ہے۔ مگر کیونکہ یہ اسکول کے بچوں کا مقابلہ ہے اس لئے اس کے فائنل مقابلے میں دوڑنے والوں کو سات میل دوڑنا ہوگا۔"

"معاف کرنا بھائی۔" شہزاد دری پر لیٹ کر بولا۔ "میں اتنی لمبی ریس میں حصہ نہیں لے سکتا۔"

سرفراز بھی لیٹ گیا۔ "مجھے بھی معاف کردینا شہریار، میں بھی تمہارے کسی بے وقوفانہ فیصلے کو نہیں مان سکتا۔ غضب خدا کا سات میل! یار شہریار، تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ سات میل کتنے ہوتے ہیں دس کلو میٹر سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔"

شہریار نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "یا خدا کن بے وقوف دوستوں سے پالا پڑ گیا ہے ارے احمقو۔ میں تم سے میراتھن ریس میں حصہ لینے کو کب کہہ رہا ہوں۔!"

شہزاد اور سرفراز اچھل کر بیٹھ گئے۔

"اچھا!" سرفراز نے کہا۔ "ایک دفعہ پھر معاف کرنا یار ہم تو سمجھے تھے کہ....."

"تم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔" شہریار نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "کیونکہ سمجھنے کے لئے آدمی کا سمجھدار ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بہرحال، بات یہ ہے کہ ہمارا اسکول ..... بلکہ ہمارے اسکول کے چار لڑکوں کی ٹیم اس میراتھن ریس کے فائنل میں اگلی جمعرات کو نیلے اسکول کا مقابلہ کررہی ہے۔"

"نیلا اسکول!" ضیاء نے کہا۔ "وہ جو چوک کے پاس ہے جس کی عمارت نیلے رنگ کی ہے اور اسکول کے بچوں کی یونیفارم بھی نیلے رنگ کی ہے۔ اسی کی بات کررہے ہو نا۔"

"ہاں۔" شہریار نے کہا۔ "وہی نیلا اسکول ہمارے اسکول کے چار لڑکے اور نیلے اسکول کے چار لڑکے اس میراتھن مقابلے میں حصہ لیں

گے۔ سات میل کی دوڑ ہوگی۔ جس اسکول کا لڑکا پہلے منزل تک پہنچے گا' وہی اسکول فاتح قرار پائے گا۔ اور ٹرافی جیت جائے گا۔"

"تو اس میں آپ کو کیا پریشانی ہے؟" شہزاد نے پوچھا۔

"مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔" شہریار نے کہا۔ مگر آج صبح مجھے جمال ملا' ہمارے اسکول کی ٹیم کا کپتان۔ وہ دبلا پتلا لڑکا جو نویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ نیلے اسکول والے کوئی بے ایمانی کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ وہ ہر حال میں یہ مقابلہ جیتنا چاہتے ہیں۔"

"بے ایمانی۔!" سرفراز نے غصے سے کہا۔ "کیسی بے ایمانی؟"

"یہ تو ابھی مجھے نہیں معلوم کہ نیلے اسکول والے کیسی بے ایمانی کریں گے۔ انہی کے اسکول کے دو لڑکوں نے خفیہ طور پر جمال کو اطلاع دی ہے کہ مقابلے کے دوران بے ایمانی ہو سکتی ہے۔"

"مگر اس کے دوران بھلا کیسے بے ایمانی ہو سکتی ہے؟" ضیاء نے پوچھا۔

یہ کوئی عام ریس نہیں ہے۔" شہریار مسکرایا۔ "یہ میراتھن ریس ہے۔ سات میل لمبی ریس ہے جس میں لڑکوں کو ٹیڑھے میڑھے راستوں سے' مختلف چھوٹی سڑکوں سے اور نہ جانے کہاں کہاں سے گزرنا ہوگا۔ دنیا کے مشہور مقابلوں میں تو دوڑنے والوں کے ساتھ ساتھ گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ ٹی وی والے ان کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ مگر اس چھوٹے سے اسکول کے چھوٹے سے مقابلے میں تو راستے میں کوئی بھی نہیں دیکھ سکے گا کہ کیا بے ایمانی ہوئی۔ ریس اسکول سے شروع ہوگی۔ وہاں اساتذہ اور طالب علم موجود ہوں گے اور پھر جہاں ریس ختم ہوگی وہاں مقابلے کے جج اور دوسرے طالب علم وغیرہ موجود ہوں گے تاکہ مقابلے کے فاتح کا فیصلہ کر سکیں۔ راستے میں کوئی چیک نہیں کر سکے گا کہ کسی نے بے ایمانی تو نہیں کی۔"

سرفراز' ضیاء اور شہزاد خاموش اور ساکت بیٹھے تھے۔ شہریار کی بات ان کی سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔ چند لمحوں بعد ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ان کے چہرے جگمگانے لگے۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو' شہریار۔" سرفراز نے آہستہ سے کہا۔ "شاید اب حق اسکواڈ کے میدان میں نکل آنے کا وقت آگیا ہے۔"

☆ --- ☆ --- ☆

وہ ایک ہفتہ انہوں نے تیاریاں کرتے گزارا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا تیاریاں کر رہے ہیں۔ کن کاموں میں مصروف ہیں۔ اسکول کے

بعد اپنے "ہیڈ کوارٹر" میں بیٹھ کر کیا باتیں کرتے رہتے ہیں۔

بالآخر مقابلے کا دن آپہنچا۔

"حق اسکواڈ" والے جس اسکول میں پڑھتے تھے اسے سبز اسکول کہا جاتا تھا کیونکہ اسکول کی عمارت پر ایک بہت بڑا سبز پرچم بنا ہوا تھا اور ان کے مقابلے میں جو اسکول تھا' اس کی عمارت نیلی تھی لہٰذا اسے نیلا اسکول کہا جاتا تھا۔

میراتھن ریس کا فائنل سبز اسکول اور نیلے اسکول کی ٹیموں کے درمیان تھا۔

جب دوڑ شروع ہونے والی تھی تو "حق اسکواڈ" کے چاروں نوجوان اپنے اسکول کی ٹیم میں شامل چاروں لڑکوں کے ساتھ ساتھ نظر آرہے تھے۔ وہاں طالب علموں کا ہجوم تھا۔ دونوں اسکولوں کے طالب علم اپنے اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھانے آئے تھے۔

ریس نیلے اسکول سے شروع ہورہی تھی۔ دوڑ میں حصہ لینے والوں کو سات میل کا فاصلہ طے کرکے واپس سبز اسکول پہنچنا تھا جہاں ریس ختم ہونی تھی۔

بالآخر ریس شروع ہونے کا وقت آگیا۔

ریفری نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز سنتے ہی ایک قطار میں کھڑے آٹھوں لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے چار لڑکوں نے نیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور چار نے سبز لباس پہن رکھا تھا۔

لوگوں کے نعروں اور چیخوں اور سیٹیوں کے شور میں ان آٹھوں لڑکوں نے بھاگنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔

ریس تو شروع ہوگئی مگر جس بات پر بیشتر لوگ حیران تھے وہ یہ تھی کہ نیلے اسکول کے لڑکوں نے اس ریس کا آغاز بہت تیز رفتاری سے کیا تھا۔ یہ بات کون نہیں جانتا کہ لمبی ریس کا اسٹارٹ آہستہ آہستہ لیا جاتا ہے تاکہ لمبا فاصلہ طے کرنے کے لئے دم خم آخر تک باقی رہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہی نیلے اسکول کے لڑکے سبز اسکول کے لڑکوں سے کہیں آگے نکل گئے۔ اس برتری پر نیلے اسکول کے دیگر لڑکے پھولے نہیں سما رہے تھے اور شور کر کرکے انہوں نے آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ سبز اسکول کے لڑکوں کو یقین تھا کہ سات میل لمبی ریس میں یہ رفتار برقرار نہیں رکھی جاسکتی اس لئے سبز اسکول کی ٹیم جلد ہی اپنے حریفوں کو جالے گی۔

تماشائی اب پیدل ہی سبز اسکول کی طرف چل پڑے۔

ان لڑکوں کو سات میل کا سفر طے کرکے

واپس سبز اسکول پہنچا تھا۔ دونوں اسکولوں کے طالب علم اور اساتذہ ایک مختصر راستے کے ذریعے چند ہی منٹ میں سبز اسکول پہنچ گئے۔ سب جانتے تھے کہ ریس میں شامل لڑکے پون گھنٹے سے پہلے واپس نہیں پہنچ سکیں گے۔ سات میل کم نہیں ہوتے۔

کچھ ہی دیر بعد سبز اسکول اب پر رونق نظر آنے لگا۔ جیسے وہاں کوئی میلہ لگا ہوا ہو۔ دونوں اسکولوں کے طالب علموں نے ایک دوسرے کے خلاف نعرے بازی شروع کردی۔ پھر تالیوں کے ساتھ ایک دوسرے کے اسکول کے خلاف گانے شروع ہوگئے۔ ایک گروپ کہہ رہا تھا۔

"سبز کلر کے لڑکے ہیں
بالکل طوطے لگتے ہیں!"

دوسرا گروپ گیت گا رہا تھا۔

"نیلے ہیں بھئی نیلے ہیں
لڑکے کتنے ڈھیلے ہیں"

لڑکوں کے اساتذہ بھی یہ مقابلے بازی دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

آدھے گھنٹے تک یہ گانے چلتے رہے۔ ایک گروپ کے لڑکے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ دوسرے گروپ والوں نے بریک ڈانس شروع کردیا۔

اب سبھی کو اس بات کا انتظار تھا کہ دوڑ میں شریک لڑکے واپس لوٹیں۔ ہر ایک کو امید تھی کہ انہی کے اسکول کے لڑکے کامیاب ہوں گے۔

بالآخر دُور..... بہت دُور، سڑک پر کچھ سائے سے نظر آنے لگے۔

سبز اسکول میں سناٹا چھاگیا۔

وہ سائے قریب آنے لگے۔ واضح ہونے لگے۔ کبھی لگتا تھا کہ دو لڑکے ہیں۔ کبھی لگتا تھا کہ چار ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بھاگتے چلے آرہے تھے۔

پھر منظر صاف ہونے لگا۔

بھاگنے والے لڑکوں کے کپڑوں کا رنگ نظر آنے لگا۔

وہ سب..... وہ سب نیلے کپڑوں والے تھے.....

چار لڑکے تھے۔ چاروں نے نیلے کپڑے پہن رکھے تھے!

سبز اسکول والوں کے چہروں پر مایوسی چھاگئی۔

اور نیلے اسکول والوں نے نعروں اور چیخوں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ ہر طرف اسکول والوں کے نعرے گونج رہے تھے۔

"نیلے آگئے میدان میں ہو جمالو
نیلے چھاگئے میدان میں ہو جمالو"

اور سبز اسکول والے خاموش کھڑے تھے

صدمے نے ان کی زبانیں بند کردی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ کامیابی کی منزل کی طرف جو چار لڑکے بڑھتے آرہے ہیں وہ سب کے سب نیلے اسکول کے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے نیلے اسکول کے چاروں لڑکے دوڑتے ہوئے اس لکیر کو پار کرگئے۔ جہاں ریس کو ختم ہونا تھا۔ ان کے ساتھیوں نے ان کو کندھوں پر اٹھالیا۔ ذرا سی دیر میں ان کی گردنوں میں ڈھیروں ہار ڈال دیئے گئے تھے۔

سبز اسکول کے اداس تماشائیوں میں شہریار اور سرفراز بھی شامل تھے۔ کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ آخر سبز اسکول والے لڑکے کہاں رہ گئے ہیں۔

دس منٹ بعد سبز اسکول کے لڑکے اسی طرح دُور..... بہت دُور سے آتے نظر آئے۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے اور پوری توانائی جمع کرکے دوڑتے آرہے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ قریب آگئے۔ بمشکل تمام انہوں نے فنشنگ لائن پار کی اور پھر انہیں ان کے دوستوں نے سنبھال لیا۔

نیلے اسکول کے لڑکے بدستور نعرے لگا رہے تھے۔ ہر طرف ہنگامہ برپا تھا۔

اس ہنگامے میں کسی نے نہیں دیکھا کہ سرفراز اور شہریار اپنے اسکول کی ہار جانے والی ٹیم کے کپتان جمال کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ جمال کا سانس پھولا ہوا تھا۔ بری طرح ہانپتے ہانپتے اس نے شہریار پر نظر ڈالی جو اس کے سامنے آکر کھڑا ہوا تھا۔

شہریار نے سوالیہ نظروں سے جمال کو دیکھا۔ جمال نے آہستہ سے سر ہلایا اور صرف اتنا کہا "تم ٹھیک کہتے تھے۔"

سرفراز اور شہریار جیسے اسی اشارے کے منتظر تھے۔ وہ اچانک مڑے اور لڑکوں کے ہجوم میں کہیں غائب ہوگئے۔ سبز اسکول کے دوسرے لڑکے چیخ چیخ کر جمال سے پوچھ رہے تھے کہ آخر ان کے اسکول کی ٹیم کو اتنی بری شکست کیوں ہوئی ہے؟ مگر جمال کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔

پھر اسپیکرز پر سبز اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کی آواز بلند ہوئی اور ہر طرف خاموشی چھاگئی۔

وہ کہہ رہے تھے۔ "سات میل کی یہ میراتھن دوڑ آپ سب کے سامنے اختتام کو پہنچی ہے۔ اس مقابلے میں طالب علموں نے جس جوش و جذبے سے حصہ لیا اس پر میں آپ سب کو مبارک دیتا ہوں۔ کھیل کا اصل مقصد ہارنا یا

جیتنا نہیں ہے۔ کھیل کا مقصد ایک صحت مند سوچ پیدا کرنا ہے۔ مقابلے کی خواہش پیدا کرنا ہے۔ میں بہت خوشی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ آج کے اس مقابلے میں....."

اچانک آواز بند ہوگئی۔

لڑکوں نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر انہیں احساس ہوا کہ مائیکروفون خراب ہوگیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی پریشان نظر آرہے تھے۔ انہوں نے دائیں بائیں دیکھا۔ اسی وقت اسکول میں بجلی کا کام کرنے والا بھاگتا ہوا آیا۔ پہلے اس نے مائیکروفون کو چیک کیا۔ پھر اس نے کہا۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب میرا خیال ہے کہ ایمپلی فائر میں کوئی خرابی ہوگئی ہے۔ میں چیک کرتا ہوں۔"

الیکٹریشن نے دائیں طرف کھڑے لڑکوں کے ہجوم کو ہٹایا اور پیچھے رکھے ہوئے ایمپلی فائر کو دیکھا پھر اس نے ایک تار جوڑ دیا اور مڑ کر کہا۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب تار نکل گیا تھا۔ اب ٹھیک ہوگیا ہے۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں یہ کہہ تھا کہ کھیل میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ پورے جذبے کے ساتھ کھیل میں شریک نظر آئے ہیں۔ میں نہایت خوشی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ آج کی میراتھن ریس میں....."

آواز پھر غائب ہوگئی۔

شاید پھر تار نکل گیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے غصے سے الیکٹریشن کو دیکھا۔ الیکٹریشن پھر بوکھلا کر ایمپلی فائر کی طرف بھاگا۔ لڑکوں کو ہٹا کر وہ نیچے جھکا۔ تار واقعی نکلا ہوا تھا۔ اس نے غصے سے لڑکوں کے ہجوم کو دیکھا اور بولا۔ "یہ کون شرارت کررہا ہے؟"

قریب کھڑے سرفراز نے معصومیت سے کہا۔ "ہمیں کیا ضرورت ہے شرارت کرنے کی۔ تمہارا تار ہی صحیح نہیں ہے۔ ذرا ٹھیک طرح لگانا اس مرتبہ۔"

اس بار الیکٹریشن نے تار واقعی ٹھیک لگایا اور خود وہیں کھڑا ہوگیا۔

لڑکوں کے ہجوم میں کھڑے سرفراز کو کسی نے اس وقت ہاتھ ہلا کر اشارہ کرتے نہیں دیکھا۔

کسی نے اس بات پر بھی غور نہیں کیا کہ اسکول کے اندر، عمارت کی پہلی منزل کی ایک کھڑکی میں شہزاد کھڑا ہوا تھا جس نے وہ اشارہ دیکھ لیا تھا۔

اشارہ ملتے ہی وہ کھڑکی میں سے غائب ہوگیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے پھر بولنا شروع کیا۔

"اب میں آج کے اس مقابلے کے نتیجہ کا اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ آج کی میراتھن ریس میں....."

اور آواز..... پھر غائب ہو گئی!

کچھ طالب علم ہنسنے لگے۔ کچھ شور مچانے لگے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کو غصہ آگیا تھا۔ انہوں نے گرج کر الیکٹریشن سے کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم ایک مائیکروفون ذرا سی دیر کے لئے ٹھیک نہیں رکھ سکتے ہو۔"

الیکٹریشن کانپتے ہاتھوں سے ایمپلی فائر کو چیک کرنے لگا۔ پھر وہ بھاگتا ہوا ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس آیا اور مائیکروفون کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب۔ بجلی چلی گئی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ..... سارے علاقے کی بجلی چلی گئی ہے....."

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے غصے سے دیکھا۔ پھر وہ بولے۔ "بہت احمق آدمی ہو تم۔ سامنے سڑک پر بجلی کی ویلڈنگ ہو رہی ہے۔ ایک دوکان میں چھت کا پنکھا چلتا نظر آرہا ہے۔ بجلی اگر نہ ہوتی تو یہ سب کیسے ہوتا؟"

الیکٹریشن نے لرزتی آواز میں کہا۔ "میں چیک کرتا ہوں سر..... ابھی چیک کرتا ہوں۔" وہ اسکول کی عمارت کی طرف بھاگا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے بغیر مائیک کے چیخنا شروع کر دیا۔ "ہم بجلی کے ٹھیک ہونے کا انتظار نہیں کر سکتے اگر آپ لوگ میری آواز سن سکتے ہیں تو میں اپنی بات آگے بڑھاتا ہوں۔ میں اس مقابلے کے نتیجے کا اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ اس میراتھن ریس میں....."

"ایک منٹ ٹھہر جایئے ہیڈ ماسٹر صاحب۔" اچانک شہریار کی آواز گونجی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

شہریار میدان کے بیچ میں کھڑا تھا۔

اس نے کہا۔ "میں آپ سے اور نیلے اسکول والوں سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

ہیڈ ماسٹر نے ناراضگی سے کہا۔ "یہ کون سا وقت ہے سوال پوچھنے کا؟"

"بہت سادہ سا سوال ہے سر۔" شہریار نے کہا۔ "میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ نیلے اسکول کی ٹیم جب سات میل کا فاصلہ طے کر یہاں پہنچی تو وہ بری طرح ہانپ کیوں نہیں رہی تھی؟ ہمارے اسکول کے لڑکوں کا سانس تو اتنا پھولا ہوا تھا کہ ان سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔ وہ فاصلہ طے کر کے کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے تھے۔"

ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

پھر نیلے اسکول کے ایک طالب علم نے چلا

کر کہا۔ "ہمارے لڑکے بہت صحت مند ہیں۔ اچھے ایتھلیٹ ہیں روز میلوں بھاگتے ہیں۔ وہ اس طرح نہیں ہانپتے جیسے تمہارے اسکول کے لڑکے ہانپتے ہیں۔"

اچانک نعرے بازی شروع ہوگئی۔ دونوں اسکولوں کے طالب علموں نے چیخنا اور نعرے لگانا شروع کردیا۔ "خاموش ہوجایئے۔" اسپیکر پر ہیڈماسٹر صاحب کی آواز گونجی۔

سب خاموش ہوگئے۔

ہیڈماسٹر صاحب نے کہا۔ "شہریار تمہیں ہار کو خوش دلی سے قبول کرنا چاہئے۔ شکست کھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم چھوٹے بچوں کی طرح رونا شروع کردو۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔" شہریار نے کہا۔ "لیکن غلط میں بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ آپ کو میری بات سن کر غصہ نہیں آیا۔ کیونکہ یہ جو ہانپنے کی اور سانس پھولنے کی بات میں نے کہی ہے، یہ خود آپ کے بھی دل کو لگی ہے۔"

"اچھا۔ بس اب چپ ہوجاؤ۔" ہیڈماسٹر صاحب نے کہا۔ "کھیل میں صرف نتیجہ دیکھا جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے مقابلے کو زندگی اور موت کا مقابلہ مت سمجھو۔ ہار جیت ہوتی ہی رہتی ہے۔"

شہریار ہنسا۔ "یہ بات اب آپ کو نیلے اسکول والوں کو سمجھانی پڑے گی سر۔" اس نے سر گھما کر پیچھے دیکھنے کے بعد کہا۔ "کیونکہ میراتھن ریس کا اصل نتیجہ اب سب کے سامنے آنے والا ہے۔"

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟" ہیڈماسٹر صاحب نے پوچھا۔

شہریار نے کوئی جواب نہ دیا۔

صرف سر گھمائے، پیچھے دیکھتا رہا۔

کچھ لڑکوں نے اس کی طرح پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

پھر کچھ اور لوگ مڑے اور پیچھے دیکھنے لگے۔

دور ..... بہت دور ..... سڑک پر کوئی بھاگتا ہوا آرہا تھا۔

بھاگتے بھاگتے وہ قریب آنے لگا۔ اتنا قریب ..... کہ اسے پہچاننا آسان ہوگیا۔

وہ ضیاء تھا! "حق اسکواڈ" کا رکن۔ تیز دوڑنے کا ماہر۔!

اور وہ ایک لفافہ اٹھائے بھاگتا چلا آرہا تھا۔

"میں آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔" شہریار کی آواز گونجی۔ "کیونکہ یہ جو اتنی دیر سے کبھی ایمپلی فائر خراب ہوجاتا تھا، کبھی بجلی چلی جاتی تھی، کبھی فیوز غائب ہوجاتا تھا ..... یہ سب

ہماری کارستانی تھی۔ "حق اسکواڈ" کا کام تھا۔"

لڑکے، ہیڈ ماسٹر صاحب، سب حیران کھڑے سن رہے تھے۔

شہریار بولتا رہا۔ "تارسرفراز نے نکالا تھا۔ مین سوئچ بند کرنے اور فیوز غائب کرنے کا کام شہزاد نے کیا تھا۔ اور خود میں ..... خود میں بھی اس کارروائی میں شریک تھا۔ میں نے یہاں بحث کرکے، سوالات پوچھ کے ..... وقت ضائع کیا ہے۔ آپ سب کا اور اپنا تاکہ نیلے اسکول کی کامیابی کے اعلان سے پہلے کچھ ثبوت آپ کو دکھادیئے جائیں۔"

نیلے اسکول والے لڑکوں میں سے چند لڑکوں کے چہروں پر پریشانی نمودار ہوگئی تھی۔ ضیاء برق رفتاری سے دوڑتا ہوا اب ان کے پاس آپہنچا تھا۔ اس نے ایک لفافہ شہریار کو تھمادیا۔ شہریار نے اس میں سے کچھ نکالا۔ دیکھا اور پھر لفافہ لے کر ہیڈماسٹر صاحب کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے وہ لفافہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو دیا اور خود مائیکروفون سنبھال لیا۔

اس نے کہا۔ "نیلے اسکول والوں نے یہ مقابلہ جیتنے کے لئے ایک سازش کی تھی۔ انہوں نے راستے میں اپنی ٹیم کے لڑکوں کو ایک کار میں بٹھایا اور تین چار میل آگے لے جاکر چھوڑ دیا۔ ہماری ٹیم نے سارا فاصلہ بھاگ کر طے کیا اور نیلے اسکول والوں نے آدھے سے زیادہ فاصلہ کار میں طے کیا۔ مگر ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہمارے اسکول میں "حق اسکواڈ" موجود ہے۔ ہمارے دوست ضیاء نے اس بار کمال دکھایا ہے۔ اس کے پاس کیمرہ تھا اور اس نے ایک جگہ پر چھپ کر فوٹو گرافی کی ۔ اس نے نیلے اسکول والوں کے کار میں بیٹھنے اور روانہ ہونے کی تصویریں اتار لیں۔ یہ صرف چار ہی تصویریں ہیں۔ مگر ان چار تصویروں کو دیکھ کر ہی پوری کہانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ پھر ضیاء وہاں سے سیدھا لیبارٹری روانہ ہوگیا تاکہ فلم دھلوا سکے۔ اس کے پرنٹ بنوا سکے۔ اس میں ایک گھنٹہ تو لگنا ہی تھا۔ اب ہمارا کام تھا کہ ہم ایک گھنٹے تک مقابلے کے نتیجے کا اعلان نہ ہونے دیں۔ سو ہم نے یہی کیا۔ آپ لوگ پریشان تو ہوئے۔ مگر سچ کو سامنے لانے کے لئے تھوڑی بہت پریشانی تو برداشت کی جاسکتی ہے۔"

ہر جانب گہری خاموشی تھی۔

سب یوں کھڑے تھے جیسے کسی نے جادو کے زور سے انہیں پتھر کا بنادیا ہو۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اور اساتذہ کو یقین نہیں آرہا تھا مگر ثبوت ان کے سامنے تھا۔ نیلے اسکول

والوں نے بے ایمانی کی تھی۔ چار تصویروں میں وہ کار میں بیٹھتے اور روانہ ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

شہریار نے مائیک پر انتہائی جذباتی انداز میں سب کو بتایا کہ "یہ بات تو آپ کو اس وقت ہی سمجھ لینی چاہئے تھی جب نیلے اسکول والوں نے ریس کے آغاز میں انتہائی تیز رفتاری دکھائی۔ یہ تیز رفتاری محض اس لئے تھی کہ وہ شروع ہی میں سبز اسکول والوں سے کافی دور نکل جائیں اور پھر ایک موڑ پر کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ سکیں۔"

شہریار نے بتایا کہ ان لڑکوں کے کار میں بیٹھتے ہی ان کی جگہ دو تازہ دم لڑکوں نے کار سے اتر کر دوڑنا شروع کردیا تاکہ اگر سبز اسکول کے کھلاڑی موڑ مڑنے کے بعد دُور دیکھیں بھی تو انہیں نیلے اسکول کے لڑکے دوڑتے ہوئے نظر آئیں۔ دونوں ٹیموں میں زیادہ فاصلے کی وجہ سے ڈمی کھلاڑیوں کو پہچاننا ناممکن تھا۔ اسی طرح کافی فاصلہ طے کرلینے کے بعد ایک اور موڑ پر جو فنشنگ لائن سے زیادہ دُور نہیں، اصل ٹیم کے لڑکے کار سے اتر کر دوڑنے لگ گئے جبکہ جعلی کھلاڑی کار میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔"

شہریار نے جیوری سے درخواست کی کہ اس کا موقف سنا جائے اور ان تصاویر اور دیگر شواہد پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا جائے۔ جیوری نے تصاویر کا جائزہ لیا۔ دونوں کھلاڑیوں کی جسمانی کیفیت اور ان کے چہروں کا بغور جائزہ لیا اور پھر کاغذ پر کچھ لکھ کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہاتھوں میں تھمادیا۔

بالآخر ہیڈ ماسٹر صاحب کی آواز گونجی۔ "میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ آج کا مقابلہ۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رکے۔ "آج کا مقابلہ سبز اسکول نے جیت لیا ہے۔ نیلے اسکول کی ٹیم کو بے ایمانی کرنے کی وجہ سے مقابلے سے خارج کیا جاتا ہے۔"

ہر طرف نعروں اور تالیوں کا شور بلند ہوا۔

سبز اسکول والوں نے رقص کرنا شروع کردیا۔ سیٹیاں بجانا اور گیت گانا شروع کردیا۔

"ساتھیو۔" اسپیکرز پر اس بار شہریار کی آواز گونجی۔ "ایک بات تو ہم بھول ہی گئے۔"

اس کی آواز سن کر سب اچانک خاموش ہوگئے اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ لڑکوں کے ہجوم میں کھڑے سرفراز نے چلا کر کہا۔ "ہاں ہمیں یاد آگیا ہے۔" شہریار نے مائیکروفون تھام کر پوری قوت سے نعرہ لگایا۔ "حق اسکواڈ" سینکڑوں آوازوں نے اس نعرے کے جواب میں چلا کر کہا۔ "زندہ باد۔" اور ان کی آواز آسمان تک گونجتی چلی گئی۔ ●●●

بلیاں بلونگڑے

فضل حق

ماں : "تم کو بلی کی دم نہیں کھینچنا چاہئے۔"

بیٹا : "کھینچا تانی تو بلی کر رہی ہے۔ میں تو صرف اس کی دم پکڑے کھڑا ہوں۔"

☆ --- ☆ --- ☆

ماں : "تم بلی کو چڑیا کا دانہ کیوں کھلا رہے ہو؟"

بیٹا : "اس لئے کہ میری چڑیا بلی کے اندر ہے۔"

☆ --- ☆ --- ☆

"درخت کے اوپر پھنسی ہوئی ایک بلی سے زیادہ شور کون کر سکتا ہے؟"

"درخت کے اوپر پھنسی ہوئی دو بلیاں۔"

☆---☆---☆

"چار ٹانگوں پر چار ٹانگیں' چار ٹانگوں کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"بلی کرسی پر بیٹھی چوہے کا انتظار کر رہی ہے۔"

☆ --- ☆ --- ☆

"بلی کے پاس کیا ہوتا ہے جو چوہوں کے پاس نہیں ہوتا۔"

"بلونگڑے"

☆ --- ☆ --- ☆

"جناب ہم نے آپ سے یہ بلی خریدی تو آپ نے فرمایا تھا کہ یہ چوہوں کے لئے اچھی ثابت ہوگی۔ لیکن اس نے تو ایک چوہا بھی نہیں پکڑا۔"

"تو میں نے ٹھیک کہا تھا نا چوہوں کے لئے اچھی ہوئی نا پھر؟"

☆ --- ☆ --- ☆

بلی گئی کھا گولہ کا اون
چھے نے اس پھر دیے بچے
ٹوپی اونی پہ سر کے چار
تھے پہنے سوئیٹر نے دو

☆ --- ☆ --- ☆

"جناب آپ نے بلی کو ڈبونے کے لئے جو چیک دیا تھا وہ واپس آگیا ہے۔"

"جناب بلی بھی واپس آگئی ہے۔"

☆ --- ☆ --- ☆

جادو کا مقابلہ

محمد جاوید خالد

وہ تینوں ایک کمرے میں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ تینوں نو عمر تھے۔ ایک بھائی اور دو بہنیں۔ ان کے ماں باپ بہت امیر تھے اور ان کی وسیع و عریض حویلی میں کئی کمرے تھے مگر وہ ایک ہی کمرے میں بیٹھے سرگوشیاں اس لئے کر رہے تھے کہ ان کا مقابلہ ایک خطرناک جادوگر سے تھا اور جادوگر ایسا جو مکار تھا۔

یہ مکار جادوگر شہر سے کچھ فاصلے پر ایک ویران سی جگہ پر رہتا تھا۔ اس کی مکاریوں اور شعبدہ بازیوں سے سارا شہر ہی واقف تھا اور خوف زدہ بھی۔ اس مکار جادوگر نے ایک ہفتہ پہلے ہی ان کے ہاں چوری کی تھی اور بظاہر عام سی تین چیزیں لے اڑا تھا۔ وہ تینوں ان تین چیزوں کے دوبارہ حاصل کرنے کے طریقے سوچ رہے تھے۔ ان کی چیزیں جادوگر کے قبضے میں تھیں اور جادوگر خطرناک تھا۔

ایک ہفتہ پہلے یہ جادوگر ایک پھیری والے کے روپ میں ان کی حویلی پہنچا تھا۔ ملازمہ نے دروازہ کھولا اور ٹافیاں، بسکٹ وغیرہ بیچنے والے کو دیکھا۔ اس نے منع کر دیا کہ کسی چیز کی ضرورت

نہیں ہے۔ لیکن بوڑھا پھیری والا کچھ دیر ستانے اور پانی پینے کا کہہ کر اندر چلا آیا۔ ملازمہ نے ترس کھا کر اسے اندر آنے دیا اور ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ کچھ دیر کے لئے ڈرائینگ روم کی طرف گئی۔ اسی اثناء میں بوڑھے پھیری والے نے کچن کا جائزہ لیا اور تین چیزیں اٹھا کر فرار ہوگیا۔ یہ تین چیزیں تھیں دودھ کا جگ' چاندی کا چمچہ اور لکڑی کی پلیٹ۔ عام آدمی تو انہیں عام سی چیزیں ہی سمجھتا مگر دراصل یہ بہت خاص چیزیں تھیں۔ یہ چیزیں جادو کی تھیں اور ان کی امی نے بہت بڑی رقم خرچ کرکے انہیں خریدا تھا۔ جگ کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دن میں تین بار بہترین دودھ سے خود بخود بھر جاتا تھا۔ چاندی کے چمچے میں یہ خوبی تھی کہ اسے منہ میں ڈالتے ہی شدید بھوک کا احساس ہوتا تھا اور پلیٹ کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ہر وقت ہلکی ہلکی موسیقی سناتی رہتی۔ موسیقی کی دھنیں سننے والے کی کیفیت کے مطابق بدلتی رہتی تھیں۔ ملازمہ نے آکر بوڑھے پھیری والے کو غائب پایا ساتھ ہی اسے ان چیزوں کے گم ہونے کا احساس ہوا تو وہ الٹے پاؤں اندر کی طرف بھاگی اور بیگم صاحبہ کو اطلاع دی۔ وہ غصے سے کھڑی ہوگئیں۔ انہوں نے کہا "پھیری والے کا حلیہ بتاؤ اسے فوری گرفتار کراتے ہیں۔ مگر جب ملازمہ نے حلیہ بتایا تو وہ اسی خطرناک جادوگر کا تھا جسے سن کر بیگم صاحبہ کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ کیونکہ جادوگر سے پوچھا جاتا تو وہ صاف انکار کردیتا کہ اس نے یہ چیزیں چرائی ہیں بلکہ ایسا تو اس سے پوچھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

تینوں بچے سخت غصے میں تھے۔ ان کے غصے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ تینوں چیزیں ان کے کام کی بھی تھیں اور انہیں بہت پسند بھی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے ماں باپ نے انہیں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس معاملے میں کچھ نہیں کرسکتے۔ ان چیزوں کے لئے تو اب صبر ہی کرنا پڑے گا۔ دونوں لڑکیاں تو رو دھو کر چپ ہوگئی تھیں مگر ان کا بھائی جیکی صبر کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اپنی چیزوں کو واپس لینے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا اور دونوں بہنیں اسے پرامید نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ "وہ مارا" جیکی نے چٹکی بجائی۔ "اسکیم ذہن میں آگئی ہے۔ میں نہیں ڈرتا اس بوڑھے اور مکار جادوگر سے۔ میں خود جادوگر کا حلیہ بنا کر اس کے پاس جاؤں گا اور تم دیکھنا۔" اس نے اپنی بہنوں سے کہا۔ "اپنی چیزیں واپس لے کر آؤں گا۔" "ہم بھی چلیں گے۔" دونوں لڑکیاں ایک ساتھ بولیں۔ "ٹھیک

ہے" جیکی نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "تم لوگوں کی ضرورت بھی پڑے گی۔" اس نے چپکے چپکے دونوں بہنوں کو کچھ ہدایات دیں اور پھر تینوں بچے اپنے سونے کے کمرے میں چلے گئے اور اپنے بستروں پر لیٹ کر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایسے بن گئے جیسے گہری نیند سو رہے ہیں۔

گھڑیال نے رات کے بارہ بجائے اور تینوں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نیند ان میں سے کسی کو بھی نہیں آئی تھی۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ تینوں بہت پُرجوش تھے۔ "اگر ہم یہ معمولی کام بھی نہ کر سکیں تو ہمارے لکھنے پڑھنے کا فائدہ ہی کیا۔" جیکی نے یہ کہا اور چھلانگ مار کر بستر سے نیچے آگیا۔ دونوں لڑکیوں نے بھی یہی کیا اور پھر وہ تینوں دبے پاؤں تہہ خانے کی طرف چل دیئے۔

ایک لمبا سا چغہ اور بڑا سا ہیٹ اس کے ابو کبھی استعمال کیا کرتے تھے۔ اب جیکی کے کام آرہا تھا۔ ہیٹ اس کے سر پر بہت بڑا تھا جو اس نے کاغذ ٹھونس ٹھونس کر پورا کرلیا۔ گردن میں ایک رنگ برنگا مفلر پہن لیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے تہہ خانے سے کچھ عجیب و غریب چیزیں اور اٹھائیں۔ ان میں دو تو بلوور تھے جن کے آگے بڑے بڑے پنکھے لگے ہوئے تھے۔ پچھلے حصے میں چرخی لگی ہوئی تھی جسے گھمانے سے پُرشور آواز کے ساتھ تیز ہوا پیدا ہوتی تھی۔ دو پانی کی بڑی بوتل نما کین تھیں جن کے منہ پر فوارے کی طرز کے سوراخ بنے ہوئے تھے۔ کچھ دیر سوچ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جیکی نے آتش بازی کا کچھ سامان بھی جیب میں رکھ لیا جس میں پٹاخے وغیرہ شامل تھے۔ یہ سامان اس نے پچھلے دنوں ہی لاکر رکھا تھا۔

جادوگر کا گھر ان کی حویلی سے بہت دور تو نہیں تھا مگر تینوں کو بہت زیادہ محنت مشقت کی عادت نہیں تھی۔ اس لئے تینوں بھاری سامان کے ساتھ تھوڑی دیر ہی میں ہانپنے لگے۔ جیکی بہت حوصلہ مند لڑکا تھا۔ زیادہ سامان بھی اسی نے اٹھا رکھا تھا۔ اسی کے جوش نے دونوں بہنوں کو بھی چاق و چوبند کر رکھا تھا۔ جیسے تیسے تینوں بہن بھائی رات کے اندھیرے میں جادوگر کے مکان تک پہنچ ہی گئے۔ عقبی دیوار کے ساتھ جیکی کو ایک دفعہ پھر محنت کرنا پڑی۔ بڑی بڑی اینٹیں اور پتھر اس نے جما جما کر تلے اوپر رکھے اور دیکھتے ہی دیکھتے مکان کی چھت تک پہنچنے کا ایک راستہ بن گیا۔

"لڑکیو! میری ہدایات یاد ہیں نا۔" جیکی نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔" دونوں لڑکیوں نے جوش سے سرہلائے۔

"ٹھیک ہے پھر ریڈی۔" اس نے دونوں بہنوں کو یکے بعد دیگرے جادوگر کے مکان کی چھت پر چڑھادیا۔

اب جیکی کو اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ہیٹ کو ایک دفعہ اور مضبوطی سے سر پر جماتے ہوئے اس سے آدھی پیشانی ڈھانپ لی پھر کوٹ کے کالر اونچے کرتے ہوئے وہ دروازے پر آگیا۔ اس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر دروازے پر پورے زور سے مارا اور ساتھ ہی ناک اور حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالیں۔ جادوگر میٹھی نیند سو رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "کون ہو سکتا ہے؟ اور وہ بھی اس وقت!" اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ "اس وقت اس طرح کی حرکت تو کوئی مجھ سے بڑا جادوگر ہی کر سکتا ہے۔" اس نے سوچا اور آہستہ آہستہ جاکر دروازہ کھول دیا۔ سامنے جیکی اپنے عجیب و غریب حلیے کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ ذرا نہ گھبرایا۔ "ہیلو جادوگر!" اس نے اپنی آواز کو بھاری بناتے ہوئے کہا۔ "میرا نام ریلوبی ریمونی روچون ہے اور میں چاند سے آیا ہوں۔ کیا مجھے اندر آنے کے لئے نہیں کہو گے؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں جناب۔" جادوگر ایک دم مرعوب سا ہوگیا تھا۔ آیئے تشریف لایئے۔ اس نے تھوڑا سا جھک کر اشارہ کرتے ہوئے کہا اور جیکی آہستہ آہستہ چلتا ہوا جادوگر کے گھر میں داخل ہوگیا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم حیرت انگیز قسم کے کارنامے کر سکتے ہو۔ کچھ مجھے بھی دکھاؤ۔" اس نے کہا۔

جادوگر تھوڑا سا ہچکچایا پھر اس نے کہا "جناب، آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ میرے حکم پر سونا ہوا میں اڑتا ہوا میرے ہاتھ میں آجاتا ہے اور چاندی پانی میں بہتی ہوئی مجھ تک پہنچ جاتی ہے اور میرے ایک کرتب سے سننے والوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ستاروں سے موسیقی کی آواز آرہی ہے۔"

"ہپ، یہ تو بہت معمولی کام ہیں۔" جیکی نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم ہوا کو پابند کر سکتے ہو کہ وہ تمہارا حکم مانے؟" "جناب والا یہ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔" جادوگر نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"اوہو یہ تم میرے سامنے کہہ رہے ہو۔" جیکی نے رعب سے کہا اور تیزی سے چلتا ہوا چمنی تک گیا جو کمرے کے ایک کونے میں لگی ہوئی تھی اور جس کا دوسرا سرا چھت کے کچھ اوپر

تک نکلا ہوا تھا۔ اس نے چمنی کی طرف منہ کرکے زوردار آواز سے کہا۔ "سنو ہواؤ! نیچے آؤ اور اس حقیر جادوگر کو بتاؤ کہ تم کیسے میرا حکم مانتی ہو۔"

دونوں لڑکیوں نے جوں ہی بھائی کی آواز سنی انہوں نے بلور کو چمنی کے سرے پر رکھ کر زور زور سے ان کی چرخی گھمانا شروع کردی۔ آناً فاناً ہوا کے تیز جھکڑ چمنی کے راستے کمرے میں داخل ہوئے۔ قریب ہی آگ روشن تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دھویں سے سارا کمرہ بھر گیا۔ چنگاریاں اڑنے لگیں۔

"بس بس مجھے یقین آگیا۔" جادوگر کھانستے ہوئے چلایا اور جیکی نے دوسرا حکم جاری کیا اور ہوائیں رک گئیں۔ جادوگر متاثر نظر آرہا تھا۔ اس نے متجسس نظروں سے جیکی کو دیکھتے ہوئے کہا "میں نے اس طرح ہوا پر حکم چلاتے ہوئے اس سے پہلے کسی کو نہیں دیکھا۔" "یہ تو کچھ نہیں ہے، میں تو بارش کو بھی حکم دے سکتا ہوں۔" جیکی نے رعب سے کہا۔ وہ پھر چمنی تک گیا اور بارش کو آواز دی۔ دونوں لڑکیاں تیار تھیں۔ انہوں نے بوتلوں کو الٹا کیا اور چمنی سے ٹپ ٹپ پانی برسنے لگا۔ "آگ بجھ جائے گی۔" جادوگر چلایا۔ "مجھے یقین آگیا، مجھے یقین آگیا، بارش بند کروادو۔" اور جیکی کے کہتے ہی بارش بند ہوگئی۔ جادوگر بہت مرعوب ہوگیا تھا۔ "اور تم چاہو تو ....." جیکی کی آواز کچھ اور رعب دار ہوگئی تھی۔ "بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک بھی اس کمرے میں دیکھ سکتے ہو۔" وہ ایک دفعہ پھر چمنی تک گیا، اس کے حکم کی دیر تھی۔ جادوگر کے مکان کی چھت خوفناک گڑگڑاہٹ سے گونجنے لگی۔ وقفے وقفے سے تیز روشنی بھی چمنی میں چمک رہی تھی۔ جادوگر پر تو گویا سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ "کیا میں طاقتور نہیں؟" جیکی نے سکوت توڑتے ہوئے خوفناک آواز میں پوچھا۔ "بے شک آپ بہت عظیم ہیں۔" جادوگر نے عقیدت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم بھی یہ طاقت حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

"کیا آپ مجھے سکھا دیں گے؟" جادوگر خوشی سے چلایا۔

"ہاں! میں ایسا کرسکتا ہوں۔ لیکن اس کے بدلے تم مجھے کیا دو گے؟"

"میں؟" جادوگر نے کہا۔ "میں سونے کی تھیلیاں اور چاندی کے ڈھیر آپ کی نذر کرسکتا ہوں۔"

"ہپ، یہ سب میرے پاس موجود ہیں میں دنیا کا امیر ترین فرد ہوں۔" جیکی نے ناگواری سے کہا۔

"پھر' اس حقیر جھونپڑی میں جو بھی آپ مناسب سمجھیں۔" جادوگر نے انکسار سے کہا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ "ٹھہریں" اس نے کہا۔ میرے پاس کچھ عجیب و غریب جادو کی چیزیں ہیں۔ میں وہ آپ کو پیش کردوں گا۔" یہ کہہ کر جادوگر نے جیکی سے دودھ کے جگ' چاندی کے چمچے اور لکڑی کی پلیٹ کا تعارف کرایا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" جیکی نے دل چسپی سے کہا اور جیب سے ایک لفافہ نکال کر جادوگر کی طرف بڑھایا۔ "سنو!" اس نے کہا۔ "اس لفافے میں ایک کاغذ ہے جس پر اس طاقت کا راز لکھا ہوا ہے لیکن اگر تم نے کل صبح سے پہلے اسے دیکھا تو یہ تحریر اڑ جائے گی۔ اسے لے کر چمنی کی دیوار کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤ۔ ایک ہاتھ لفافے پر اور دوسرا اس کے نیچے رکھو اور جیسے ہی سورج کی پہلی کرن چمنی سے اندر آئے' لفافے کو اس کے سامنے کرکے اسے کھول لینا۔" جادوگر نے حیرت اور شوق سے لفافہ تھام لیا اور جیکی اپنی تینوں چیزیں سنبھالے اعتماد سے قدم اٹھاتا دروازے سے باہر نکل گیا۔

راستے بھر تینوں بہن بھائی اپنی چالاکی اور جادوگر کی بیوقوفی پر قہقہے لگاتے ہوئے آئے۔ اگلی صبح جب انہوں نے اپنی امی کو ہنس ہنس کر رات کا کارنامہ سنایا تو وہ سناٹے میں آگئیں پھر وہ مسکرائیں ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو ڈانٹ پلائیں یا ان کو شاباش دیں۔

ادھر جادوگر رات بھر بیوقوف بنا بیٹھا سردی سے کانپتا رہا۔ صبح سویرے نہایت شوق اور بے تابی سے اس نے لفافہ کھول کر کاغذ نکالا اور پھر بے وقوفوں کی طرح اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ کاغذ پر لکھا تھا۔

ہوا کا راز بلور میں ہیں
پانی کا راز ہے بوتل میں
اور آتش بازی گرج چمک
ہونقوں کی طرح گھنٹوں مغزماری کرنے کے باوجود بھی جب جادوگر کے پلے کچھ نہ پڑا تو کاغذ ہاتھ میں پکڑے وہ شہر کی طرف آگیا۔ شہر کے سارے عقل مندوں سے اس نے رجوع کیا مگر اس عجیب و غریب تحریر کو کوئی نہ سمجھ سکا۔ سنا ہے جادوگر کو آج بھی ایسے عقل مند شخص کی ضرورت ہے جو اس تحریر کو سمجھنے میں اس کی مدد کرسکے اور اسے عظیم طاقت کا مالک بنادے۔

The Three Naughty Children

Eileen A.Soper

مقابلے کے اِمتحان میں مُلک بھر میں اوّل آنے والے

عاکف سے باتیں

ابو اسامہ

یوں تو ہر امتحان ایک مقابلہ ہے اور ہر مقابلہ ایک امتحان مگر ہمارے دنیوی امتحانوں میں ایک امتحان واقعی ایسا ہے جسے ہم بجاطور پر مقابلے کا امتحان کہہ سکتے ہیں۔ یہ امتحان "سی ایس ایس" یعنی "سینٹرل سپیریئر سروسز" کا ہے۔ جیساکہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس امتحان کے ذریعہ سرکار اپنی اعلیٰ ترین ملازمتوں کے لئے ایسے باصلاحیت افراد کا انتخاب کرتی ہے جو اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے علاوہ اپنی علمی لیاقت کے حوالے سے بھی قابلِ رشک ہوتے ہیں۔ مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہونے والے وہ نوجوان جو علم کے حقیقی مفہوم سے واقف ہوتے ہیں وہ اس امتحان کو پاس کرنے کے بعد عجز و انکسار کی تصویر بن جاتے ہیں۔ شجرِ سایہ دار بن کر خود محنت کی دھوپ میں جلتے ہیں اور دوسروں کے لئے ٹھنڈی چھاؤں کا سامان کرتے ہیں۔ اچھی تربیت اور بہتر تعلیم پانے والے طالب علم جب اس مقابلے میں کامیاب ہوتے ہیں تو ان کی صورت اس شعر کی سی ہوتی ہے۔

آیا جو پھل تو شاخِ ثمردار جھک گئی
کہتی ہوئی کہ شکر ہے پروردگار کا

ان کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو اس امتحان کو اپنی شان اور بڑائی کے لئے پاس کرتے ہیں۔ اس مقابلے میں کامیاب ہونے کے بعد ان کی گردن تن جاتی ہے۔ چال میں فرق اور آنکھوں میں رعونت آجاتی ہے۔ ایسے لوگ عام انسان کو چھوت کی ایسی بیماری سمجھتے ہیں جس سے دور رہنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ

لوگ اپنی طرح کے لوگوں میں رہ کر خوش رہتے ہیں۔ خدمتِ خلق ان کا منشاء نہیں ہوتا۔ ان کی پوری زندگی اپنے افسروں کو خوش کرنے' اپنے تعلقات کو نبھانے اور اپنے آپ کو معاشی طور پر مستحکم کرنے میں گزرتی ہے۔ اس کے باوجود ان کا خیال یہ ہے کہ دھرتی کا توازن انہی کے دم سے قائم ہے۔ یہ نہ ہوں تو کائنات میں ہلچل سی مچ جائے۔ حکومتوں کو چلانے والے اداروں کو بنانے والے' اصل حکمران یہی ہوتے ہیں۔ یہ اچھے ہوں تو ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ اچھے نہ ہوں تو دشمن کو بھی زحمت نہیں کرنا پڑتی۔

ہمارا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہم ان صفحات میں بُرے افسران کی بھد اڑائیں یا ان پر تنقید کریں۔ ایسا کرنے کا حوصلہ بھلا ہم میں کہاں ہے ہمارا مقصد تو اپنے تو عمر ساتھیوں کو صرف یہ بتانا ہے کہ جس طرح ہر معاشرے میں اچھے اور برے لوگ پائے جاتے ہیں اسی طرح اعلیٰ افسران میں بھی اچھے اوصاف اور بری خصلتوں کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔

مقابلے کا امتحان پاس کرلینے سے اعلیٰ ملازمت کا حصول تو آسان ہوجاتا ہے مگر اعلیٰ کردار کا حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آج کے اس گئے گزرے دَور میں بھی ایسے افسران موجود ہیں جن کے دل اللہ کی یاد سے سرشار اور جن کی زندگی کا لمحہ لمحہ خلقِ خدا کی خدمت سے عبارت ہے۔ یہی لوگ حقیقت میں بڑے لوگ ہیں آنکھوں پہ بٹھائے جانے والے اور دلوں میں بسائے جانے والے یہ لوگ تعداد میں کم سہی مگر ہیں تو۔ ان کا دم غنیمت ہے کہ یہ بھی نہ رہے تو پھر چار سُو اندھیرا رہ جائے گا۔

اعلیٰ علمی صفات اور اعلیٰ انسانی صفات یکجا ہوجائیں تو سوچیئے کیسی خوبصورت تصویر بنتی ہوگی۔ ایسی ہی ایک تصویر میں اپنے البم سے نکال کر آپ کو دکھا رہا ہوں یہ تصویر عاکف کی ہے۔

عاکف مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے تو ملک بھر میں اول آئے۔ اول بھی اس طرح آئے کہ دوسرے نمبر پر آنے والا ان سے ۱۳۷ نمبر پیچھے تھا۔ ۱۴۰۰ میں سے ۱۰۳۶ نمبر حاصل کئے۔ اتنے نمبروں کا حصول خود اپنی جگہ ایسا ریکارڈ ہے جس کی نظیر پچھلے بہت سے برسوں میں نہیں ملتی۔ سی ایس ایس پاس کرنے کے بعد اپنے لئے ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ (ڈی ایم جی) کو پسند کیا۔ مختلف جگہوں پر ایس ڈی ایم رہے۔ پھر قلعہ سیف اللہ بلوچستان میں' پولیٹیکل ایجنٹ

(ڈپٹی کمشنر) رہے۔ دو سال تک مدینہ منورہ میں ڈپٹی ڈائریکٹر حج کے طور سے رہے اور ہر روز روضۂ رسولؐ کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کیا۔ حرم سے اس قربت کو ہمیشہ اپنی خوش بختی خیال کیا۔ آج کل کراچی میں واقع کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن میں کمپنی سیکریٹری ہیں۔

سید ابو احمد عاکف پورا نام اردو ادب کی معروف شخصیت ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے صاحبزادے اور اردو ادب کے معتبر نام جناب ثاقب کانپوری کے پوتے ہیں۔ عاکف چھوٹے سے تھے کہ ایک حادثے میں والدہ اور دو بھائیوں کا ساتھ چھوٹ گیا۔ جس ماں کی گود میں آنکھ کھولی وہ بھی اردو کے افق پر ستارے کی طرح ابھریں اور پھر غروب ہو گئیں' طاہرہ کشفی' شعر و ادب کے حوالے سے ایک ممتاز نام بیگم بلقیس کشفی نے ننھے سے عاکف کو ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ عاکف کے بننے سنورنے میں جہاں بہت سے عوامل ہیں وہاں "باجی" کا بڑا حصہ ہے۔ بیگم بلقیس کشفی صاحبہ کو ہم "باجی" کہتے ہیں۔

عاکف نے تین سال تک ابتدائی تعلیم جامعہ کراچی میں واقع اسکول سے حاصل کی پھر ابو کے ساتھ امریکہ چلے گئے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے اسکول سے چوتھی اور پانچویں جماعتیں پاس کیں۔ چھٹی اور ساتویں پھر کراچی سے اور پھر اس کے بعد جاپان جا نکلے۔ آٹھویں سے دسویں تک کی تعلیم جاپان میں حاصل کی۔ انٹر آدم جی سائنس کالج کراچی سے اور ایم ایس سی (مائیکرو بائیولوجی) کراچی یونیورسٹی سے کیا۔ سنہ ۱۹۸۲ء میں سی ایس ایس کے امتحان میں شریک ہوئے اور ملک بھر میں اول رہے۔ دوران تعلیم مختلف نوعیت کی علمی ادبی سرگرمیوں سے متعلق رہے۔ جامعہ کراچی کے سالانہ مجلّہ "الجامعہ" کے لئے ہم نے مل جل کر کام کیا۔ عاکف حصہ انگریزی کے مدیر تھے۔ ترتیب و تالیف کے حوالے سے ۲ کتابیں ان سے منسوب ہیں۔ انگریزی پر عبور ہے' جاپانی فرفر بولتے ہیں' عربی سے اچھی واقفیت ہے۔ دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا اور سیکھنا ان کا مشغلہ ہے' مباحثہ اور فوٹو گرافی کے شوقین ہیں۔ عاکف کا خیال ہے کہ اصل مقابلے کا امتحان تو وہ ہے جس سے ہم دن رات گزر رہے ہیں اور جس کا نتیجہ کسی اور دنیا میں ملنے والا ہے۔

عاکف کی غیر معمولی کامیابی کے حوالے سے میرا پہلا سوال تھا۔ عاکف صاحب وہ کون سی "گیدڑ سینگی" ہے جس سے آپ نے ایسی غیر

عاکف ، ایک ڈرامے میں قاضی کا کردار

معمولی کامیابی حاصل کرلی۔ یا جس سے ایسی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے؟

عاکف کا جواب تھا "مقابلے کے امتحان کے لئے وہ رسمی تیاری اتنی اہمیت نہیں رکھتی جو ہم امتحان کے دنوں میں کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اصل اہمیت اس تیاری کی ہے جو ہم زندگی بھر کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے آج تک کیا دیکھا؟ کیا سمجھا؟ کیا یاد رکھا؟ اگر زندگی کے سخت مقابلوں کا اندازہ پہلے سے کرلیا جائے اور روز اول ہی سے اچھا طالب علم بن کر رہا جائے تو پھر یہ مقابلہ نسبتاً" آسان ہوجاتا ہے۔"

آپ اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ یہ سی ایس ایس کی طرف کہاں آنکلے؟

"ضروری تو نہیں کہ ہر پڑھا لکھا آدمی شعبۂ تعلیم ہی میں کھپ سکے۔ زندگی کے اور شعبے بھی تو ہیں جس طرح یہ ضروری نہیں کہ ہر نیک آدمی مکہ اور مدینہ میں پیدا ہو۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں۔ یوں بھی آپ دیکھیں تو آپ کو بہت سے پڑھے لکھے لوگ اس شعبے میں نظر آئیں گے قدرت اللہ شہاب، مختار مسعود، مصطفیٰ زیدی، یہ سب لوگ علمی حوالوں سے بڑے نام ہیں جبکہ ان سب کا تعلق سول سروس سے رہا ہے سرکاری ملازمت میں رہنا اور یہاں رہ کر زندگی کے کسی ایک شعبے میں خدمت

سرانجام دینا بھی انسانی زندگی کا بہت بڑا تجربہ ہے۔"

دوران ملازمت کبھی پچھتاوے کی کیفیت ہوئی یا یہ خیال آیا کہ کاش! اس شعبے میں بھی نہ آیا ہوتا؟

"پچھتاوے کی کیفیت پہلے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ جب کسی کو زیادتی کرتے دیکھتا تھا' یا اس نظام کی اندرونی خرابیوں پر نظر پڑتی تھی تو بہت جلتا کڑھتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔ جب سے ایک مجاہد کی یہ بات معلوم ہوئی جو کہتا تھا "میرا کام افغانستان سے روس کو نکالنا نہیں ہے' یہ کام تو اللہ کا ہے' میرا کام تو غاصب اور جارح دشمن پر گولی چلانا ہے۔ میں اپنا کام سرانجام دیتا رہوں گا۔" تو اب میں بھی اس مجاہد کی طرح سوچتا ہوں کہ اس دنیا کے نظام کو بدل دینا مرا کام نہیں' نہ ہی یہ میرے بس میں ہے' ہاں البتہ اپنی جگہ پر رہتے ہوئے اپنے فرائض کو ٹھیک طرح سے انجام دینا میرا کام ہے سو میں ایسا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

کبھی کسی اور شعبے میں جانے کے لئے سوچا؟

"میرا خیال ہے' کامیابی کے نئے افق دیکھنا' مقابلوں کے نئے میدانوں میں اترنا تو ایک مثبت رویہ ہے۔ سو میں ایسا سوچتا ہوں کہ مقابلوں کے

عاکف جاپان میں

اور مواقع آئے تو میں ان مقابلوں میں بھی شریک ہوں گا۔

آگے بڑھنے اور بڑھتے رہنے کی جستجو اگر ختم ہوگئی تو پھر تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

مقابلے کے امتحان میں نمایاں کامیابی کے لئے تیاری کیسے کی جائے؟ آپ اپنے تجربے سے کوئی ایسی بات بتائیں کہ طالب علموں کو راہنمائی مل سکے۔

"میرے نزدیک یہ مقابلہ پچاس فی صد "علم" اور پچاس فیصد "ذریعۂ اظہار" پر عبور کا نام ہے۔ بعض لوگ اپنے موضوع پر مکمل عبور کے باوجود اپنی بات ممتحن تک پہنچا نہیں پاتے یا انہیں متاثر نہیں کر پاتے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا ابلاغ کمزور ہے۔

ذریعۂ اظہار سے میری مراد' زبان اور

عاکف ۔ شرارت کا ایک انداز

عاکف اپنے ابو (ڈاکٹر ابوالخیر کشفی) کی گود میں۔

اسلوب دونوں ہیں۔ زبان پر عبور اور بہتر انداز تحریر یا بہتر زبانِ ابلاغ مل کر ہی بات کو مکمل کرتے ہیں۔ اس میں سے کوئی ایک چیز بھی کمزور ہوگی تو ابلاغ کا پورا عمل کمزور ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ سول سروس کا امتحان متوازن مطالعے کا امتحان ہے۔ کسی کی انگریزی بہت اچھی ہے مگر سائنس یا اسلامیات سے واقفیت نہیں ہے تو اس کے لئے بھی کامیاب ہونا ناممکن ہوگا۔ تمام مضامین کا یکساں مطالعہ ضرور کرے تیسری بات بہترین مضامین کا انتخاب ہے۔ آپ کے لئے بہترین مضامین وہ ہیں، جن میں آپ کی دلچسپی ہے، جن پر آپ کا کچھ مطالعہ ہے اور جسے آپ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔"

اگر ہم کہیں کہ ہمارے پڑھنے والوں کو آپ کوئی نصیحت کریں تو آپ کیا نصیحت کریں گے؟

"میری نصیحت تو وہی ہے جو قرآن کے الفاظ میں حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو کی تھی۔"

"کسی کو خدا کے ساتھ شریک نہ کرنا، حق تو یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے اور بدی سے منع کر اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خودپسند اور فخر جتانے والے کو پسند نہیں کرتا اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز ذرا پست رکھ۔"

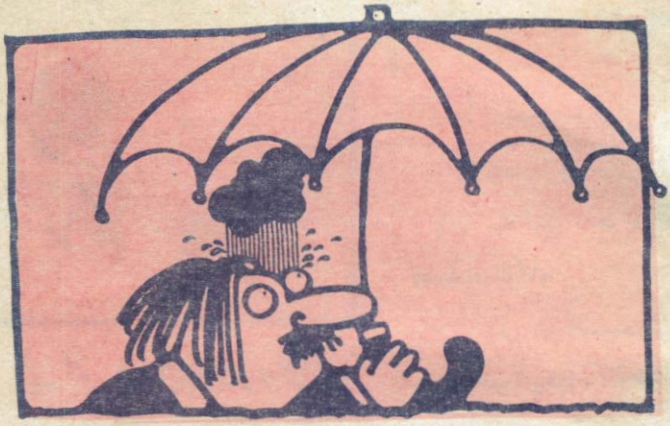

لطفِ شیطنت

کسی ہوٹل کی انتظامیہ نے ایک مقابلہ منعقد کیا۔ مقابلہ کچھ یوں تھا کہ ایک وقت میں سو روٹیاں کھانے والے کو بھاری انعام دیا جائے گا۔

اس مقابلے کو جیتنے کی ہمت صرف ایک موٹے تازے آدمی نے کی۔

مقابلہ شروع ہوا۔ آدمی نے جب ۹۹ روٹیاں کھالیں تو ہوٹل والے فکر مند ہوئے انہوں نے بے ایمانی کی اور اسکور بورڈ پر تعداد کم کردی۔ یہ سلسلہ کچھ دیر تک چلتا رہا۔ مگر آخر کار وہ آدمی غصے سے بپھر گیا۔ وہ اٹھا اور بورڈ پر تمام اسکورنگ مٹادی پھر چلا کر بولا کہ "یہ بے ایمانی میں برداشت نہیں کرسکتا اس لئے یہ مقابلہ دوبارہ سے شروع کیا جائے۔"

مرسلہ : سلمان خان یوسف زئی، حیدر آباد

☆ --- ☆ --- ☆

ایک شخص ہانپتا کانپتا گھر میں داخل ہوا۔ اس نے جیب سے ایک سونے کا کپ نکال کر الماری میں رکھ دیا۔ اس کی بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ کہاں سے لائے ہو؟"

شوہر نے کہا۔ "تیز دوڑ میں اول آیا ہوں۔"

بیوی نے خوشی سے پوچھا۔ "اچھا، دوسرے اور تیسرے نمبر پر کون آیا؟"

شوہر نے کہا۔ "دوسرے نمبر پر پولیس اور تیسرے نمبر پر دکان کا مالک!"

مرسلہ : رامین قاضی، بفرزون کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

اسپتال میں ایک پاگل شور مچا رہا تھا۔ "مجھے آزاد کردو ..... ورنہ میں اسپتال کی چھٹی منزل سے کود کر خودکشی کرلوں گا۔"

"لیکن اسپتال تو صرف تین منزلہ ہے۔" ایک نرس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، میں دو مرتبہ چھلانگ لگالوں گا۔"

مرسلہ : صدف سراج، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

باپ نے اپنے سست اور کاہل بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بیٹا! میں نے تمہارے لیے مکمل انتظام کردیا ہے اب بٹن دباؤ گے تو کھانا آجائے گا بٹن دباؤ گے تو نوکر کپڑے لے آئے گا۔ بٹن دباؤ گے تو" ..... بیٹے نے بات کاٹتے ہوئے کہا! "لیکن ابو یہ بٹن دبائے گا کون؟"

مرسلہ : سہیل محمد عارف، لیاری کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک گلاس بنانے والی کمپنی کے باہر یہ لکھا ہوا تھا۔

"ہمارے ہاں خوبصورت اور مضبوط گلاس بنتے ہیں۔ ہمارے گلاس اکیس فٹ کی بلندی سے نیچے گرائیے بیس فٹ تک ضمانت ہے گلاس نہیں ٹوٹے گا۔"

مرسلہ : سمیرا قاسم، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

تین بچے ایک جگہ بیٹھے اپنے اپنے ابو کے

دانتوں کی تعریف کر رہے تھے۔

پہلا : "میرے ابو کے دانت دودھ کی طرح سفید ہیں۔"

دوسرا بچہ : "میرے والد کے دانت موتیوں کی طرح چمک دار ہیں۔"

تیسرا بچہ : "میرے ابو کے دانت جادو کے ہیں۔ کبھی میز پر ہوتے ہیں اور کبھی ان کے منہ میں۔"

مرسلہ : عبدالقدیر فراز، اجمل شہباز عیسیٰ پنجگوری، بلوچستان

☆ --- ☆ --- ☆

مشہور سائنس دان سر آئزک نیوٹن ایک دن آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسے اس طرح دیکھ کر قصبے کے دو آدمی آپس میں قیاس آرائیاں کرنے لگے۔

ایک نے کہا، "نیوٹن آسمان پر کوئی نیا ستارہ تلاش کر رہا ہے۔"

دوسرے نے کہا، "نہیں بلکہ وہ کوئی نیا سیارہ دیکھ رہا ہے۔"

دونوں آدمیوں کے درمیان بحث بڑھ گئی تو فیصلہ یہ کیا گیا کہ نیوٹن سے چل کر پوچھ لیتے ہیں کہ وہ آسمان کی طرف منہ کر کے کیا دیکھ رہا ہے؟ چنانچہ ان میں سے ایک نے جب نیوٹن

سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے تو نیوٹن ہولے سے مسکرایا اور پھر اپنی مسکراہٹ کے دوران کہا، "اس وقت میری چھینک رک رہی ہے اور چونکہ مجھے آسمان کی جانب دیکھنے سے آسانی سے چھینک آجاتی ہے۔ اس لئے میں آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں۔"

مرسلہ : عبدالعظیم، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

تین بھلکڑ پروفیسر ریلوے اسٹیشن پر کھڑے باتیں کر رہے تھے وہ باتوں میں اتنے محو ہو گئے کہ انہیں ریل گاڑی کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ چند منٹ بعد انجن نے ہارن دیا تو وہ چونک اٹھے اور گھبرا کر ایک ڈبے کی جانب دوڑے۔ دو تو کسی نہ کسی طرح چڑھ گئے مگر ایک پروفیسر نہ چڑھ سکے۔ وہ مایوسی سے جاتی ہوئی ٹرین کو دیکھ رہے

تھے کہ ایک قلی نے کہا۔ "کوئی بات نہیں جناب اگلی گاڑی سے چلے جانا۔" پروفیسر صاحب بولے : "وہ تو میں چلا ہی جاؤں گا لیکن ان لوگوں کا کیا ہوگا؟ وہ تو مجھے چھوڑنے آئے تھے۔"

مرسلہ : محمد عمر قریشی، اسلام آباد

☆ --- ☆ --- ☆

ایک خاتون نے ماہر نفسیات سے دریافت کیا۔ "ڈاکٹر صاحب! کسی شخص کی ذہنی سطح معلوم کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟"

"یہ تو بہت معمولی بات ہے، آپ کسی سے کوئی بھی آسان سوال پوچھ لیں۔ اگر وہ فوراً" درست جواب دے دے تو اس کا مطلب ہے کہ اس میں ذہانت کی کمی نہیں ہے۔"

"مثلاً" خاتون نے پوچھا۔

"مثلاً" یہ کہ محمود غزنوی نے سومنات پر سترہ حملے کئے تھے۔ بتائے اس نے سترہواں حملہ پہلے کیا یا سولہواں؟"

خاتون چند لمحے سوچتی رہیں پھر بولیں۔ "ڈاکٹر صاحب یہ ذرا مشکل سوال ہے۔ کوئی آسان سا سوال بتایئے۔"

☆ --- ☆ --- ☆

مرزا صاحب کو موسیقی کا شوق ہوا تو بازار سے ایک پرانا پیانو خرید لائے اور رات کے ایک بجے مشق کرنے لگے۔ ان کے پڑوسی کا دماغ گھوم گیا اور انہوں نے انتقام کے طور پر رات ہی میں مرزا صاحب کی ساری کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے۔

صبح کو مرزا صاحب اپنے پڑوسی سے یوں گویا ہوئے۔

"بھائی اگر آواز کم آرہی تھی تو مجھ سے کہہ دیا ہوتا میں خود کھڑکیاں دروازے کھول دیتا۔"

مرسلہ : سمیرا قاسم، حیدر آباد

☆ --- ☆ --- ☆

مصنف شوہر : "تمہیں میری کتابوں میں سے کونسی کتاب پسند ہے؟"

بیوی : "چیک بک"

مرسلہ : عبدالقدیر فراز، شوہاز عیسیٰ پنجگور

فضا میں مقابلہ

مقابلہ بھی
موت سے

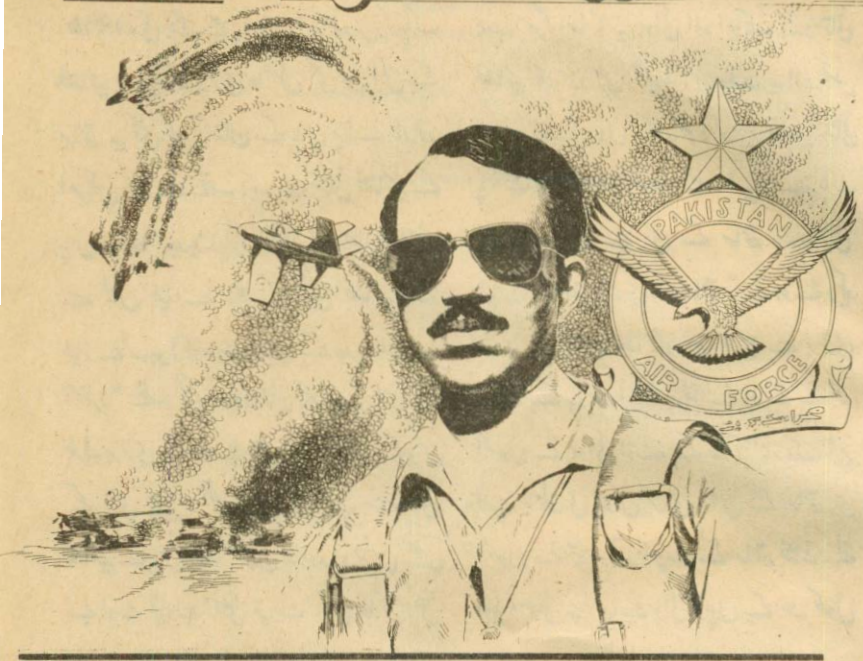

ان لمحوں کی روداد جب ایم ایم عالم کل عالم میں مشہور ہوئے

سنہری جذبوں کے حامل، عزم و ہمت کی علامت اور پاک فضائیہ کے لئے سرمایۂ افتخار ایم ایم عالم کے کارنامے اور خیالات ہماری تاریخ کا حصہ اور خوبصورت باب ہیں۔ ان سطروں میں مبالغہ آرائی بالکل نہیں ہے کیونکہ یہ سطریں "جنگ پاکستان" نامی کتاب سے لی گئی ہیں جو ایک غیر ملکی اور "غیر جانبدار مصنف جان فریکر کی تصنیف ہے مترجم لطیف احمد خان ہیں۔

سن ۱۹۶۵ء کے پاک و ہند مقابلے میں پاکستان ایئر فورس کے ایک معمولی قد و قامت والے ہواباز بھی شامل تھے۔ لیکن فضائی جنگ میں اس عام سے نظر آنے والے ہواباز نے بہادری و سرفروشی کا ایسا کارنامہ سرانجام دیا جس نے اس کے نام کو مقابلوں کی تاریخ میں زندۂ جاوید بنادیا۔ یہ نام محمد محمود عالم یعنی ایم ایم عالم کا ہے۔

فضاؤں میں برپا ہونے والے مقابلوں پر نظر ڈالتے ہوئے یہ بات ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ سن ۱۹۶۵ء کی جنگ میں انڈین ایئر فورس کو پاک فضائیہ پر پانچ گنا برتری حاصل تھی اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ پاکستان کے پاس پرانے نارتھ امریکن طیارے تھے۔ جبکہ ہندوستانی فضائیہ کے پاس نسبتاً" جدید، زیادہ طاقتور اور بھاری اسلحہ سے لیس طیارے تھے۔ پاکستانی فضائیہ کے طیارے "سیبرز" اور ہندوستان کے جدید طیارے "ہنٹرز" تھے۔ لیکن ہندوستانی فضائیہ کی اس یک طرفہ برتری کے مقابلے میں پاک فضائیہ کے پاس کچھ ایسی چیزیں تھیں جن کا جواب ہندوستانی فضائیہ کے پاس قطعاً" نہیں تھا اور وہ چیزیں تھیں بے لوث قیادت، اعلیٰ تربیت، قومی بقا کو لاحق خطرے سے ابھرنے والا عزم، جذبۂ شوقِ خدمت و شہادت اور سرفروشی و بہادری کی بہترین روایات۔

پاک و ہند جنگ کے آغاز کے بعد دوسرے دن یعنی ۷ ستمبر کو ۳۲ سالہ ایم ایم عالم اسکواڈرن نمبر ۱۱ کی کمان کرتے ہوئے سرگودھا، پنجاب کے مرکزی آپریشنل اڈے سے فضا میں بلند ہوئے۔ سرگودھا پاکستان کا واحد بڑا اڈہ تھا جس پر پاک فضائیہ کی تقریباً" تمام لڑاکا فورس جمع تھی۔ بداتفاقی یہ تھی کہ اس وقت ہوائی اڈے کے گرد صرف تین طیارے حفاظتی گشت پر محوِ پرواز تھے جب سرگودھا کا یہ ہوائی اڈہ اچانک ہندوستانی فضائیہ کی زد میں آگیا۔ اس وقت یہ اڈہ مکمل طور پر حملہ آوروں کے رحم و کرم پر تھا۔ پاکستانی پائلٹ جو اڈے پر موجود تھے۔ اپنے اپنے کاک پٹ میں بڑی بے بسی کے ساتھ ہندوستانی طیاروں کو صف بندی کے ساتھ آتے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن حملہ آور ہر طرح سے برتری رکھنے کے باوجود ایسے بوکھلائے ہوئے تھے کہ انہوں نے ہوائی اڈے کے خالی "ٹارمک" پر اپنے اسلحہ کی بارش کردی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے تیز رفتار جھپٹ کے ساتھ نشانہ لئے بغیر ۳۰ ملی میٹر دہانے والی توپوں کے منہ کھول دیئے۔

ہندوستانی طیاروں کی یہ بوکھلاہٹ پاک فضائیہ کے حق میں خوش قسمتی ثابت ہوئی اور یہ طیارے سرگودھا کے ہوائی اڈے کو ایک معمولی خراش لگائے بغیر جنوب مغرب کی طرف نکل گئے۔ پاک فضائیہ نے جنگی صورت حال اپنے حق میں بہتر نہ ہونے کے باوجود اس نازک موقع پر بھی کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل کرلی۔ کامیابی یہ تھی کہ دشمن کے طیاروں میں سے

ایک دفاعی طیارہ شکن توپ کی زد میں آگیا تھا اور دو گشتی پرواز پر موجود ایک طیارے کی توپ کا نشانہ بن گئے۔

دن کی روشنی میں ہندوستانی فضائیہ کے اس پہلے حملے کے فوراً بعد اسکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم اور ان کے نمبر ۲ فلائنگ آفیسر مسعود اختر دیگر تین طیاروں کے ساتھ ہوائی اڈے کے دفاعی گشت کے لئے پندرہ ہزار فٹ کی بلند پرواز پر روانہ ہوگئے۔ پانچ منٹ کے اندر ہی گراؤنڈ کنٹرول نے انہیں ہندوستان کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کی سمت جانے کی ہدایت کی۔ ابھی وہ مشرق کی طرف دس پندرہ میل ہی گئے تھے کہ انہیں فوراً واپس آنے کی ہدایت ملی ان الفاظ کے ساتھ کہ "ہندوستانی سرگودھا کے اوپر پہنچ چکے ہیں۔" یہ صبح چھ بج کر دس منٹ کا وقت تھا اور یہی وقت تھا اس مقابلے کے آغاز کا جس کے فاتح ایم ایم عالم کو تاریخ نے پاک فضائیہ کا بے مثال ہیرو بنادیا۔

الیف۔۸۶ کی حفاظتی پرواز پر موجود الیف۔ ۱۰۴ کے اسکواڈرن لیڈر عارف اقبال کو اس معرکے میں شرکت کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن انہوں نے شروع سے آخر تک سارا معرکہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہوائی اڈے کے گرد چکر لگا رہا تھا کہ میں نے رن وے کے اوپر چار ہنٹر طیارے دیکھے جو جنوب مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنے رابطے کو آواز دی۔ فلائٹ لفٹیننٹ بھٹی اڈے سے دس میل دور جنوب مغرب میں گشت کررہے تھے اور عالم جنوب کی طرف سے مزید پانچ میل آگے تھے۔ میں نے ہندوستانی طیاروں پر نظر رکھتے ہوئے ان کی طرف غوطہ لگایا۔ اس وقت تک یہ طیارے بھٹی اور عالم کے علاقے سے گزر چکے تھے۔ عالم اور بھٹی نے بھی رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ بھٹی کے طیارے کا ایندھن والا ٹینک بے کار ہونے لگا اس لئے بھٹی کو معرکے سے پیچھے ہٹنا پڑا لیکن اسکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم نے ہنٹر طیاروں کا تعاقب جاری رکھا۔ یہ ہنٹر ۴۸۰ ناٹ کی رفتار سے پرواز کررہے تھے۔"

"میری نظر اس وقت اصل معرکے پر پڑی جب آگ کا ایک گولہ زمین کی طرف گرتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ پانچواں ہنٹر ہوگا۔ جب عالم نے اپنے دائیں طرف دو ہنٹر طیاروں کو نشانہ بنالیا تو ہندوستانیوں نے اشارہ دیا۔ میں نے اپنے ریڈیو ٹرانسمیٹر پر ان کی کچھ گفتگو سنی۔ میں نے ان میں سے ایک کو یہ کہتے

ہوئے سنا کہ "پیشرو نمبر ۳ نشانہ بن گیا ہے۔" اسکواڈرن لیڈر عالم اس وقت جوش میں آگئے۔ ان کے مائک کا بٹن آن تھا اور وہ اپنے دستِ راست سے کہہ رہے تھے۔ "بچ کر رہو مگر میرے ساتھ ساتھ چلو۔" انڈین ہوا بازوں نے تیزی سے راستہ تبدیل کرنے کی کوشش کی لیکن جب موڑ پر آئے تو اسکوارڈرن لیڈر عالم تیسرا طیارہ گرا چکے تھے اور فوراً" ہی باقی بچنے والی جوڑی پر جھپٹ رہے تھے۔ عالم نے اپنے چوتھے شکار پر تقریباً" آٹھ سو فٹ کے فاصلے پر حملہ کیا اور آخری شکار پر اس سے بھی قریب سے نشانہ لیا۔

یہی وہ معرکہ تھا جس میں سرخروئی کی وجہ سے ایم ایم عالم کو شروع ہی سے پانچ ہنٹر طیارے تباہ کرنے کا اعزاز حاصل ہوا جن میں سے تین طیارے صرف تیس سیکنڈ میں تباہ کئے گئے۔ تیس سیکنڈ یعنی آدھے منٹ کی بساط ہی کیا ہے لیکن پاک فضائیہ کے اس شاہین نے اپنے بے پناہ جذبے سے غیر ملکی ماہرین جنگ کو بھی شدید حیرت سے دوچار کردیا۔ تین جھڑپوں میں ۹ عدد حریف طیاروں کو ٹھکانے لگانے والے عالم کا نشانہ اتنا زبردست تھا کہ خود ان کے بقول "مجھے اپنے کسی مدمقابل پر دو سے زیادہ بار فائر نہیں کھولنا پڑا۔" عالم کا کہنا ہے کہ "بے شک پرواز کی انفرادی صلاحیت فضائی معرکہ میں بہت اثر انداز ہوتی ہے لیکن عالم ہی کے بقول "حریف کی برتری کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے پرواز کی اعلیٰ صلاحیت کے علاوہ بھی کچھ درکار ہے۔ اور اس "علاوہ بھی" کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ہم اپنے جذبۂ ایمان کے تحت لڑ رہے تھے۔ ہم ان سے جو ہمارے طرز حیات کو تباہ کرنا چاہتے تھے، مسلمانوں کی طرح لڑے۔ ہم شدید تفکرات اور اکثر خوف کے لمحات سے بھی دو چار ہوئے لیکن ہمیں اپنے مقدر پر بھروسہ اور مقصد پر یقین کامل ہے۔ ان پاکستانی عوام کے لئے جو اسلامی جمہوریہ کی حیثیت سے ملک کے وجود کو معمولی بات نہیں سمجھتے یہی سب سے اہم قوت محرکہ ہے۔"

انہوں نے مزید کہا "ہم اول درجے کے مسلمان نہ بھی ہوں تب بھی ہم سب پاکستانی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہی ہمارا محافظ ہے۔ یہ ایمان کہ میری زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور میں اعلیٰ مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہوں، مجھے خوف سے نجات دلانے کے لئے کافی ہے۔ جنگ کے بھرپور آغاز سے پہلے ہی ہم تین چار پائلٹوں کو ہندوستان میں

آدم پور کے ہوائی اڈے پر حملے کے لئے ہدایت دی گئی ۔ ان ہدایات میں کہا گیا تھا کہ ہماری انٹیلی جنس رپورٹ کے مطابق اس اڈے پر ۴۸ طیارے کھڑے ہیں۔ ہم نے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ لیکن ہم سب جانتے تھے کہ یہ مشن ہمارے لئے آخرت کا سفر ہو سکتا ہے اور اسکواڈرن لیڈر رفیق جیسے ساتھی کے لئے واقعی یہ سفرِ آخرت ثابت ہوا۔ میں نے ایک پائلٹ کو بلایا اور اپنی ماں کے نام ایک مختصر خط اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ اگر میں واپس نہ آسکوں تو یہ خط میری ماں کو پہنچا دینا۔" میں صرف یہ جانتا تھا کہ حکم کی تعمیل کرنا ہے اور کچھ نہیں۔ جب ہم واپس آئے تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی ایسی طاقت ہے جو ہم سے بہت بڑی ہے وہی تمام چیزوں کی محافظ ہے۔"

وہ بلندی جو انکسار میں ہے

غرور اور کسرِ نفسی کی مثال ایک سمندر اور چشمے کی سی ہے پہاڑوں کے دامن سے نکلنے والا ایک ننھا سا چشمہ دن رات اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتا رہتا ہے اس کے برعکس سمندر اپنی لامحدود وسعت اور بے پناہ گہرائی کے باوجود سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے خاموشی سے کائنات کو تکتا رہتا ہے گرمیٔ آفتاب اور ٹھنڈک ماہتاب کو وہ اپنے سینے میں سمولیتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب انسانی عظمت کے مقصد کے تحت ہی وجود میں آئے ہیں۔ خلوص، وفا اور محبت و یگانگت کے جذبے کسرِ نفسی ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ زہد و تقویٰ اور راست بازی سے صرف اپنی ذات کو ہی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ دوسرے بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں اور یہ صفاتِ کسرِ نفسی کے ذریعے ہی ملتی ہیں۔ دوستی بھی کسرِ نفسی کی محتاج ہے۔ تکبر اور دوستی دو متضاد چیزیں ہیں جہاں تکبر ہو گا وہاں خلوص و دوستی نہ ہو گا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "آدمی کے لئے اتنی ہی برائی کافی ہے کہ وہ دوسروں کو حقیر سمجھے۔" شیخ سعدیؒ کا مقولہ ہے "دنیا میں وہی لوگ عظیم ہیں جو غرور کے تاج کو دور پھینک دیتے ہیں۔"

سلمیٰ فیصل، اوچ شریف

نام میرے نام

آنکھ مچولی ملا تو ایسے لگا جیسے گلشن میں کھلا ہوا کوئی حسین پھول، جیسے دھنک کے سات رنگ، جیسے ٹھنڈی ٹھنڈی لطیف ہوا، جیسے بارش کی پہلی بوند، جیسے چاند کی چاندنی، جیسے کوئی مزیدار سی سوئٹ ڈش، جیسے کوئی سبق آموز دلچسپ کتاب، جیسے کوئی معطر خوشبو لیکن آنکھ مچولی میں اپنا خط دیکھ کر ذرا خوشی نہ ہوئی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میرا خط ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے۔ **عنبرین نصر قریشی، پشاور۔** عنبرین قریشی، ہم سے قسم لے لیجئے ہم نے آنکھ مچولی کے ساتھ اتنی بہت سی چیزیں نہیں بھیجی تھیں۔ آپ کو کیسے مل گئیں؟ ضرور ڈاکیے نے کچھ کردیا ہوگا۔ تعریف کا شکریہ لیکن تعریف ہمیں بالکل بھی اچھی نہیں لگی بلکہ تعریف ہمیں راس بھی نہیں آتی، ہمارے پڑھنے والے اکثر ہماری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور پھر اچانک موڈ خراب ہوجائے تو یہی آسمان سے اٹھا کر زمین پہ پٹخ دیتے ہیں۔ اب آپ کراچی کی **ہما شریف صدیقی** کا خط ہی سن لیجئے۔ لکھتی ہیں "چڑیل مریل سا آنکھ مچولی ملا۔ ایک تو مہنگا ترین پرچہ اوپر سے یہ خستہ حالی کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا ہوگیا ہے۔"

☆ عنبرین! آپ ہی بتائیے کہ آپ کے خط کے فوراً" بعد ہما شریف کا خط کیا ہمیں کڑوی کونین کی طرح نہیں لگا ہوگا۔ ویسے ہما صاحبہ آپ اتنی برہم کیوں ہیں؟ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جب آپ نے آنکھ مچولی دیکھا ہو اس وقت آپ کی طبیعت اچھی نہ ہو، ہم نے یہی سنا ہے کہ طبیعت اچھی نہ ہو تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ ایک

بات یاد رکھیں کہ آنکھ مچولی آپ کی تحریروں کے باعث اچھا ہے' اگر کبھی کوئی کمزوری سر چڑھ کر بولے تو سمجھ لیجئے کہ آپ ہی کی جانب سے اچھی تحریریں کم موصول ہوئیں۔ تاہم ہم اسے صحت مند' تندرست و توانا اور اچھا اچھا بنانے کی کوشش کریں گے۔ وعدہ..... آپ نے کچھ اچھی تجاویز بھی دی ہیں۔ جو نوٹ کرلی گئی ہیں۔

تاج **محمد زہری**' **پسنی مکران** سے مخاطب ہیں' لکھتے ہیں۔" سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ..... (مسز) ردی کی ٹوکری ہماری تحریروں کی بھوکی کیوں ہوتی ہے؟ آپ نے میرا خط شائع نہ کیا تو مجھ پر قیامت گزر جائے گی۔"

عطر کی شیشی پتھر مار کے توڑ دوں گا　　خط نہ لکھا تو خط لکھنا ہی چھوڑ دوں گا

☆ بھائی تاج! آپ کو تڑیاں لگانی خوب آتی ہیں' آپ نے نظم اور نثر دونوں میں ہمیں دھمکایا ہے کہ شاید کوئی ایک نسخہ کام کرجائے۔ ہم نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ہم آپ کا خط شائع نہیں کریں گے تاکہ آپ عطر کی شیشی کو پتھر پہ دے ماریں' اس طرح چار سُو عطر کی جو خوشبو پھیلے اس خوشبو پھیلنے کا اصل محرک ہم بن جائیں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر آپ کا خط شائع کررہے ہیں کہ آپ نے شیشی اگر سر راہ توڑ دی تو کوئی راہ گیر بے چارہ زخمی بھی ہوسکتا ہے۔ ویسے آپ سمیت سب پڑھنے والے یہ سن لیں کہ ہمارے ہاں ردی کی ٹوکری نہیں ہوتی ہاں البتہ ردی کا ڈرم ضرور ہوتا ہے اور یہ ڈرم صرف ردی چیزوں کے لئے ہوتا ہے۔

حافظ آباد سے **صائمہ ارم اعوان** نے بڑی اہم اور بنیادی بات کی ہے' لکھتی ہیں "ہمارے بہت سے ساتھی اردو سے ناواقف ہیں خصوصاً" الفاظ کے صحیح استعمال' تلفظ اور اعراب وغیرہ سے۔ اگر آپ لوگ اس موضوع پر کچھ لکھیں اور پڑھنے والوں کو گرامر کے بنیادی قاعدے بتائیں تو سب کا بہت بھلا ہوگا۔"

☆ صائمہ! آپ نے ہمارے جذبات کو اپنی زبان دے دی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس مسئلے پر تو ہم بھی پریشان رہتے ہیں ہم اگر اپنے لکھنے والوں کی زبان اور اسلوب کے حوالے سے کچھ اقتباس پیش کردیں تو آپ کا ہنس ہنس کر برا حال ہوجائے گا۔ خاص طور پر اس نوعیت کی چند غلطیاں تو بہت ہی ہوتی ہیں مثلاً" الفاظ کو ملا کر لکھنا' جیسے "آجشکو" جیسے "مردمشماری" وغیرہ اسی طرح پیراگراف کا خیال نہیں رکھا جاتا' (Punctuation) یعنی فل اسٹاپ اور کامے وغیرہ تو اردو لکھنے والوں کو ویسے ہی معاف ہیں۔ لکھتے ہوئے اکثر ساتھی اس بات کا بھی خیال نہیں رکھتے کہ اگر ایڈیٹر اس تحریر میں کچھ ردوبدل کرنا چاہے تو کہاں لکھے؟ اس لئے کہ خالی جگہ تو ہوتی ہی نہیں۔ صائمہ اس مسئلے پر توجہ دلوانے کا شکریہ لیکن ایک پنجابی محاورے "جھڑا بولے' او ہوئی بُوا کھولے" کے مصداق' آپ نے اس مسئلے کو چھیڑا ہے۔ اب آپ ہی کچھ لکھیں بھی۔ ہمارا وعدہ ہے کہ آپ کی تحریر میں کچھ کمی بھی ہوئی تو کچھ اپنی آراء کو شامل کرکے اسے شائع ضرور کریں گے۔

لطیف آباد' حیدر آباد کے **سید فرحان احمد** نے دو خطوط لکھ کر ہمیں یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ جو ہمارا خطوں کے جواب دینے کا انداز ہے یہ بہت برا ہے

اور لکھا ہے کہ "چاہیں تو اس پر ریفرنڈم کروا کے دیکھ لیں۔"

☆ بھائی فرحان احمد ہم نے یہ انداز محض یہ سوچ کر اختیار کیا تھا کہ' نامے میرے نام صرف ان لوگوں کا پسندیدہ بن کر نہ رہ جائے جن کے خط شائع ہوتے ہیں بلکہ ان صفحات میں بہت سے بنیادی مسائل پر شگفتہ انداز میں مفصل بات ہو تاکہ سبھی اسے دلچسپی سے پڑھیں۔ محتاط اندازے کے مطابق تین سو سے زائد خطوط ایسے آچکے ہیں جن میں اس انداز کو سراہا گیا ہے بلکہ آپ واحد ہیں جنہیں یہ انداز اچھا نہیں لگا۔ پھر بھی وضاحت کردیجئے کہ آپ پر کیا گراں گزرتا ہے۔ "شگفتگی" "مفصل جواب" اس کے Lay out کا انداز یا کچھ اور۔ دیکھئے ہم نے آپ کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہیں بھی غیر سنجیدہ ہونے کی کوشش نہیں کی۔ حد ادب کو ملحوظ رکھا۔ پھر بھی اگر آپ مصر ہیں تو ریفرنڈم کے لئے الیکشن کمیشن سے بات کی جاسکتی ہے۔

ناظم آباد' کراچی کی فرحین کو چھالیہ والا مضمون اچھا لگا انہوں نے اسے اسکول کی دیوار پر بھی چپکا دیا۔ اس کے پوسٹر بھی بنالیے۔

☆ فرحین مضمون اچھا تھا تو یہ آپ ہی کے کسی ساتھی نے لکھا تھا اس جملے کے توسط سے آپ کے جذبات ان تک پہنچ گئے۔ چھالیہ پر مضمون اچھا لگا تو کیوں نہ ہم اگلا مضمون "کتھے" پر' پھر "تمباکو" پر اور پھر "قوام" پر لکھ ڈالیں۔ آپ آنکھ مچولی کا ایک ایک لفظ پڑھتی ہیں اس پر ہم آپ کا شکریہ کیوں ادا کریں البتہ آپ پر رشک کرتے ہیں اور آپ کا حوالہ دے کر سب سے کہتے ہیں کہ دیکھو ایسے ہوتے ہیں اچھے بچے پڑھنے لکھنے والے۔

کوٹ رادھا کشن سے ساجد ثناء اللہ نے خط لکھا ہے' خط میں چار سطریں لکھنے کے بعد ہی ایک نظم شروع کردی ہے۔ "دیوانگی' دیوانگی۔ تو تو میری دل جان لگی۔ تو میرے سپنوں میں آن لگی۔ تو میرا پیار ہے....."

☆ بھائی ثناء اللہ۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ ہمارا خط کہیں اور چلا گیا اور کسی اور کے نام لکھا جانے والا ادھر آگیا۔ چلیں چھوڑیں دیوانگی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ ثناء اللہ آپ کے خط اور خوشخطی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ابھی اسکول کے طالب علم ہیں اور وہ بھی ساتویں یا آٹھویں کے۔ اس عمر میں ایسی دیوانگی اچھی نہیں۔ سیدھے سادے اور ہلکے پھلکے موضوعات پر لکھا کریں۔ ایسے موضوعات پر جو آپ پر بھی سجیں اور اس پرچے میں بھی۔

اسماء نورین نے لاہور سے بڑا مزے کا خط لکھا ہے۔ لکھتی ہیں "اوے' آنکھ مچولی کے شائع کرنے والے' السلام علیکم" یہ جملہ پڑھ کر ایسا لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہے "اے احمق' گدھے اللہ تجھے خوش رکھے۔"

☆ بی بی اسماء یہ اندازِ تخاطب اچھا نہیں لگا آپ کچھ بھی تو لکھ سکتی تھیں۔ انکل، بھائی جان، ایڈیٹر صاحب وغیرہ مگر یہ اوئے توئے تو اچھے بچوں پر زیب نہیں دیتی، ہیں نا؟ آپ کے خط میں املاء کی بہت غلطیاں ہیں۔ تبھی تو آپ کے بھائی آپ کو رسالہ پڑھنے سے روکتے ہیں۔ آپ پڑھنے لکھنے پر توجہ دیں اور بھائی سے یہ کہہ دیں کہ اچھے رسائل پڑھنے سے پڑھنا لکھنا آجاتا ہے، علم بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا اور آپ کے لئے بہت سی دعائیں اور یہ کہ تنقید کا برا ہرگز نہ مانیے گا۔

حب چوکی سے اطہر زبیری نے آنکھ مچولی کے کسی پرانے شمارے کا ورق بھیجا ہے۔ جس پر فیض صاحب کی کہانی "اسکول میں میرا پہلا دن" شائع ہوئی ہے اور مصنف نے اپنا نام "عاصم کمال" لکھا ہے۔

☆ اطہر صاحب نشاندہی کا شکریہ۔ اچھا ہوا فیض صاحب دنیا سے جلدی چلے گئے ورنہ عاصم کمال صاحب کی اس حرکت سے کتنے رنجیدہ ہوتے۔ ویسے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فیض صاحب نے اسکول میں پہلا دن جس طرح گزارا ہو، عین اسی طرح عاصم کمال صاحب پر بھی گزری ہو۔ ویسے آپ نے چوری پکڑی خوب۔ شاباش جیتے رہیئے اور عاصم کمال آپ آئندہ کبھی ایسا نہ کیجئے گا۔ ورنہ ہو گا یہ کہ لوگ آپ کی سچ مچ کی تحریر کو بھی آپ کی تحریر نہیں مانیں گے۔ اپنا اعتبار کھو دینا تو سب سے بڑا نقصان ہے۔ ہم خط لکھتے لکھتے یہاں تک آن پہنچے مگر خط ہیں کہ کم ہوتے ہی نہیں۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ 'اعجاز طالب اعجاز اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب لئے ہم سے جواب کے طالب ہیں۔ **پسنی کے اکمل شاکر** صاحب کا محبت بھرا خط، جواب کا متقاضی ہے۔ **اوچ شریف کی سلمیٰ مغل** نے چھوٹے بڑے شہروں کی بحث چھیڑی ہوئی ہے انہیں کون سمجھائے کیسے سمجھائے کہ سب شہر اپنے ہیں، سبھی سندر ہیں اور سبھی پیارے ہیں۔ **ذیلخاں سولنگی** نے گڈو سے ایسی تجاویز بھجوائی ہیں کہ عموماً "گڈو سے ایسی تجاویز کی توقع نہیں کی جاتی۔ جی ذیلخاں آنکھ مچولی مارچ میں "پاکستان نمبر" شائع کر رہا ہے۔ انشاء اللہ ضرور شائع ہو گا۔ مگر آپ بھی تو کچھ لکھیں۔ **سمیرا قاسم** سراپا احتجاج ہیں کہ ہم نے ان کے چھ خطوں میں سے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا ہائے اللہ ہم کیا کریں؟ زمیں کاغذ کی بن جائے سمندر ہو سیاہی کا، تبھی جا کر سب سے آزادی مل سکتی ہے۔ سمیرا اب تو خوش ہیں نا؟ اسلام آباد کے **محمد نسیم قریشی** صاحب نے تو منع کر دیا ہے کہ میرا خط بالکل نہ چھاپیں۔ دیکھیئے ہم بالکل نہیں چھاپ رہے۔ **کوٹلی آزاد کشمیر کے عرفان قریشی** صاحب لکھنے کے لئے پوچھنا کیسا؟ لکھیں اور بھیج دیں۔ **مظفر گڑھ سے بھائی محمد دانیال** سائنسی موضوعات سے آپ کی محبت کا انداز اچھا لگا جلد ہی نئے سائنسی سلسلے شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ **راولپنڈی کی انیلا سلیم** آپ مقابلہ نمبر پر اپنا تبصرہ لکھیے۔ آپ کا جواب ہم پر قرض، یہ قرض انشاء اللہ جلد اتاریں گے۔ وعدہ

اِس ایوان کی رائے میں

لڑکیاں بہتر پاکستانی ہیں

موافقت

کہا جاتا ہے کہ کسی بھی ملک کی ترقی کا انحصار اس کے باشندوں کی محنت اور لگن پر ہوتا ہے۔ یہی معاملہ ہمارے ملک پاکستان کے ساتھ بھی ہے۔ پاکستان صرف اسی صورت میں بہتر ملک بن سکتا ہے کہ جب اس کے باسی بہتر پاکستانی ہوں۔ اس وقت سوال یہ ہے کہ لڑکے بہتر پاکستانی ہیں یا کہ لڑکیاں۔ بادی النظر میں اس سوال کا جواب قدرے مشکل ہے کیونکہ دونوں فریق اپنے اپنے موقف کے حق میں مضبوط دلائل رکھتے ہیں لیکن غیر جانبدارانہ طرزِ فکر واضح کر سکتا ہے کہ لڑکیاں بہتر پاکستانی ہیں۔

لڑکوں کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ٹھپہ لگا دینا کہ صرف انہی کے ہاتھ میں یہ باگ ڈور ہے قطعی طور پر غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لڑکیاں بھی انہیں کی طرح بلکہ ان سے بہتر انداز میں

مختلف دفاتر، کارخانوں اور شعبہ ہائے زندگی میں چھوٹے کام کر رہی ہیں۔

موٹے دفاتر کا تو شمار ہی نہیں جبکہ بڑے بڑے اداروں میں بھی خواتین کلیدی عہدوں پر فائز نظر آتی ہیں۔ وہ ڈاکٹرز ہیں، انجینئر ہیں، استاد ہیں۔ ترقی کا پہیہ، جسے لڑکے اپنے بل پر گھومتا سمجھ رہے ہیں ان لڑکیوں کے نرم و نازک ہاتھوں کی وجہ سے گردش میں ہے۔ اگر آج ملک کے انتظامی، سیاسی اور تنظیمی نظام سے لڑکیوں کو نکال لیا جائے تو ایک عجیب اور خطرناک بحران پیدا ہوجائے گا۔ یہ درست ہے کہ دفاتر میں کام کرنے والی لڑکیاں عددی قوت میں کم ہیں مگر ان کی اہمیت سے انکار محال ہے اور جس طرح سے انہوں نے اپنی اہمیت کو تسلیم کروایا ہے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ لڑکیاں بہتر پاکستانی ہیں۔

ملکی سطح سے گھریلو سطح پر آئیں۔ لڑکے یہ کہتے ہیں کہ لڑکیاں صرف گھرداری کر سکتی ہیں۔ ان کے لئے ایک سوال ہے کہ کیا وہ گھرداری کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں تو یہ ذمہ داری بجائے خود لڑکیوں کے بہتر ہونے کی دلیل ہے۔ جبکہ لڑکیاں صرف گھرداری ہی نہیں مختلف انداز میں مختلف کام بھی کرتی ہیں۔ وہ اگر دفاتر میں کرسی میز کا کام نہیں کرتی ہیں تو گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں میں اپنے جوہر اجاگر کرتی ہیں۔ ا
محنت اور جفاکشی کے ساتھ کھیتوں میں ہل چ
ہیں جس کا مظاہرہ لڑکے کرتے ہیں بلکہ یہ
چاہئے کہ وہ لڑکوں سے بھی زیادہ سخت جان
ہیں۔ وہ اپنی دوہری بلکہ تہری ذمہ داری ا
اور خوش کن اسلوب سے سرانجام دیتی ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی نے کہا ہے ا
خوب کہا ہے کہ ؎

اے ماؤ! بہنو! بیٹیو!
دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی رونق ہو تمھی،
قوموں کی عزت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو،
عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں،
ایماں سلامت تم سے ہے

گویا یہ ان کا اعتراف نامہ ہے کہ کسی
قوم کی عزت اس کی خواتین ہوتی ہیں اور
یہ کہنے میں فخر ہے کہ بحیثیت مجموعی لڑکیاں
عزت کا خیال رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگزا
نہیں کرتیں۔ جس طرح وہ گھر میں والدین
اطاعت اور فرمانبرداری کرتی ہیں اسی طر
اپنے ملک کے لئے بھی احترام کا جذبہ رکھتی

مخالفت

لڑکے بہتر پاکستانی ہیں

محمد عثمان خان

آج میں جس موضوع پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ وہ ہے "لڑکیاں بہتر پاکستانی ہیں۔" لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں کیونکہ لڑکیاں گھر کی تو بہتر خدمت کر سکتیں ہیں لیکن ملک کی وہ خدمت نہیں کر سکتیں جو ہم لڑکے کر سکتے ہیں۔ ہم پاکستان کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں اور ہم ہی اس دھرتی کے محافظ ہیں۔ ہم نے آزادی حاصل کرنے کے بعد جب ہمارے پاس کچھ نہیں تھا اور دشمن سے ہماری آزادی ہضم نہ ہو سکی اور ہم پر وحشیانہ حملہ کیا تو یہ ہم ہی تھے کہ اپنے سے کئی گنا بڑے اور طاقت ور دشمن کو شکست فاش سے دوچار کر دیا۔ ہم نے ہی سن ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اپنی لاشیں گرادیں، خون کی ندیاں بہادیں، ہمارے شہیدوں کے خون سے یہ مٹی معطر ہے۔ لیکن دشمن کو ایک انچ بھی آگے آنے نہیں دیا۔ کیا یہ سب لڑکیاں کر سکتیں تھیں؟

یہ ہم ہی ہیں جو شب و روز اپنی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سیاچن جو دنیا کا سب سے اونچا جنگی محاذ ہے۔ جہاں سردی ناقابل برداشت دہشت گردی، رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، بیرون و اندرون ملک غلط حرکات، منشیات اور دوسری اشیاء کی اسمگلنگ کیا لڑکیاں اس قسم کے قبیح کام کرتی ہیں؟ جتنے چور ڈاکو اور قاتل قسم کے لوگ ہیں (معذرت کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ) وہ مرد ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کہیں کوئی بھولی بھٹکی مثال آپ کو مل جائے مگر بحیثیت مجموعی لڑکیاں اس قسم کے کاموں سے دور بھاگتی ہیں۔ وہ اپنے زورِ بازو اور ذہنی صلاحیتوں کو ترجیح دیتی ہیں جبکہ لڑکے تو مواقع نہ ملنے کا بہانہ کرتے ہوئے غلط راہوں پر لپک پڑتے ہیں۔

آج ہماری نام نہاد معاشرتی اقدار اور غیر اسلامی رسوم و قیود لڑکیوں کو روکنے اور پیچھے ہٹانے کے لئے سخت جدوجہد کر رہی ہیں۔ اس کے باوجود ان کی لیاقت اور قابلیت کسی نہ کسی طرح اپنا راستہ بنالیتی ہے اور نہ صرف سامنے آتی ہے بلکہ اپنا آپ منوا بھی لیتی ہے۔ اسی لئے گھر کے اندر اور گھر کے باہر، پڑھائی اور کھیل کے میدان میں ہر جگہ ان کی قابل فخر کارکردگی یہ اعتراف کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ہاں "لڑکیاں بہتر پاکستانی ہیں۔"

(شکر الحمدللہ، ختم بالخیر)

ہوتی ہے۔ جہاں پانی کا قطرہ گرتے ہی برف بن جاتا ہے۔کیا یہ نازک سی لڑکیاں یہ مشقت کر سکتیں ہیں لیکن یہ ہم ہی ہیں کہ جہاں شب و روز اپنی اس سرحد کی حفاظت کرتے ہیں اور انشاء اللہ کرتے رہیں گے۔

جناب والا!

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ جو صنعتیں، فیکٹریاں اور کارخانے ہیں یہ ہمارے ہی دم سے تو قائم ہیں جہاں پر ہم خون پسینہ بہاتے ہیں بعض کارخانوں میں تو ہم شدید گرمیوں میں جب درجہ حرارت ۴۵ ڈگری تک بڑھ جاتا ہے، ہم آگ کے سامنے کام کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر پاکستان کی کون خدمت کر سکتا ہے اور اس سے بڑھ کر کون بہتر پاکستانی ہو سکتا ہے۔

لڑکیوں کا یہ کہنا کہ ہم امتحانوں میں اکثر پوزیشن لیتے ہیں اور ہم زیادہ محنتی ہیں اور لڑکے تو پوزیشن حاصل نہیں کر سکتے۔ تو ان کے لئے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ پاکستان بہت امیر ملک نہیں ہے، ہم ابھی ترقی کی طرف گامزن ہیں۔ ہماری آبادی کا بیشتر حصہ غریبوں پر مشتمل ہے اکثر لڑکے تعلیم کی فیس ادا نہیں کر سکتے۔ یہ صبح تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بعد دوپہر کسی ورکشاپ میں کام کرتے ہیں تاکہ ان کی فیس بھی ادا ہو سکے اور گھر کا چراغ بھی جلتا رہے۔لیکن پھر بھی پوزیشن لیتے ہیں یہ کہنا غلط ہے کہ ہر پوزیشن لڑکیاں لیتی ہیں لڑکیاں تو گھر میں ہوتی ہیں گھر کے کچھ کاموں کے سوا وہ فارغ ہو جاتی ہیں ان کو پڑھنے کا زیادہ موقع ملتا ہے اور اس زیادہ پڑھنے کے مواقع رکھتے ہوئے لڑکیاں اگر پوزیشن حاصل کریں تو حیرت کی بات نہیں بلکہ نہ کریں تو شرم کی بات ہے۔

لڑکیوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ لڑکے زیادہ کھیلتے ہیں اور سارا دن کھیلنے میں گزارتے ہیں اور آوارہ گردی کرتے ہیں اور پڑھائی کی طرف ان کا کوئی دھیان نہیں ہوتا۔ لیکن یہ محض ان کا موقف ہے بعض آوارہ گرد لڑکوں سے سارے لڑکوں کو آوارہ گرد کہنا غلط ہے۔ یہ صحیح ہے زیادہ کھیلتے ہیں اور یہ کھیلنے کی ہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنے قومی کھیل ہاکی میں عالمی چمپئن کا اعزاز حاصل کیا۔ کرکٹ کے بھی عالمی چمپئن بنے اور اسکوائش کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔

دنیا کا کون سا کپ ہے جو ہمارے پاس نہ ہو اور یہ ان کھیلوں ہی کی وجہ ہے کہ آج پاکستان دنیا کے مختلف ممالک میں پہچانا جاتا ہے۔ ہم کھیل کے ذریعہ بھی اپنے ملک و قوم کا نام روشن کر رہے ہیں۔ ہم نے آج تک کوئی لڑکی نہیں

ی ہے جس نے پاکستان کے لئے کوئی کپ یا
ل حاصل کیا ہو۔ اب اس حصہ میں بھی ہم
وں سے جیت گئے۔
آج ملک کی ترقی کا پہیہ ہمارے دم سے
م رہا ہے۔ ہم اپنے ملک و قوم کی خوش حالی
لئے اور ترقی کے لئے سخت محنت اور مشقت
تے ہیں۔
ہماری وجہ سے آج پاکستان ایٹمی طاقت
بن چکا ہے اور آج اس کی وجہ سے دشمن ہماری
طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ ہم اپنے دشمن
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکتے ہیں
ہم اپنے ملک کی سب سے بڑی خدمت کر رہے
ہیں اور وہ یہ کہ سرحدوں کی حفاظت پہ ہم جان نچھاور
کرتے ہیں۔ اس خیال کے تحت کہ پاکستان ہے
تو ہم ہیں چنانچہ لڑکیوں کو ماننا پڑے گا کہ ہم نہیں
بلکہ "لڑکے بہتر پاکستانی ہیں"۔

صنصف بنام ایڈیٹر

جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم!
سب سے پہلے تو آپ کو مبارکباد پیش کرنا
ہتی ہوں کہ آپ نے طالب علموں میں بہتر
ستانی ہونے کا شعور بلند کرنے کی کوشش کی
۔
مضامین سب ہی بہت اعلیٰ ہیں۔ لیکن
رف جذبات سے کام نہیں ہوتا۔ دلائل و
ہین کی ضرورت ہوتی ہے۔ تحریری مضامین
ں تحریر، خوش خطی اور املا کی درستگی نہایت
روری اجزاء ہیں۔ ان تمام نکات کو مدنظر رکھتے
ئے صائمہ ارم اعوان کا مضمون بہترین ہے۔
یسے مقابلے آپ مستقبل میں بھی جاری
کھیے۔ میری تمام تر دعائیں اور محبتیں آپ کے
اتھ ہیں۔
دعاگو خوش بخت شجاعت

مقابلے کے حوالے سے تحریری مباحثے میں آنکھ مچولی کے قارئین نے حسبِ روایت جوش و خروش سے حصہ لیا۔ دلیل کی بات سے لے کر جوش و جذبات تک کئی تحریریں سامنے آئیں۔ جن شرکاء کی تحریروں کو مقابلے کے لئے منتخب کیا گیا ان کے نام ہیں: صائمہ ارم اعوان، حافظ آباد۔ محمد عثمان خان، کوہاٹ۔ سلمان خان یوسف زئی، حیدر آباد۔ ابن العزیز ملک احمد پوری، پشاور۔ کاشف مرزا، بورے والا۔ محمد رحمت اللہ بشیر قادری، گجرات۔ زیب النساء، لاہور۔ وسیم اطہر، بورے والا۔ طارق ریاض خان، لاہور۔ شبنم غفار، کراچی۔ نیما گل، حیدر آباد۔ اعجاز علی، گجرات۔

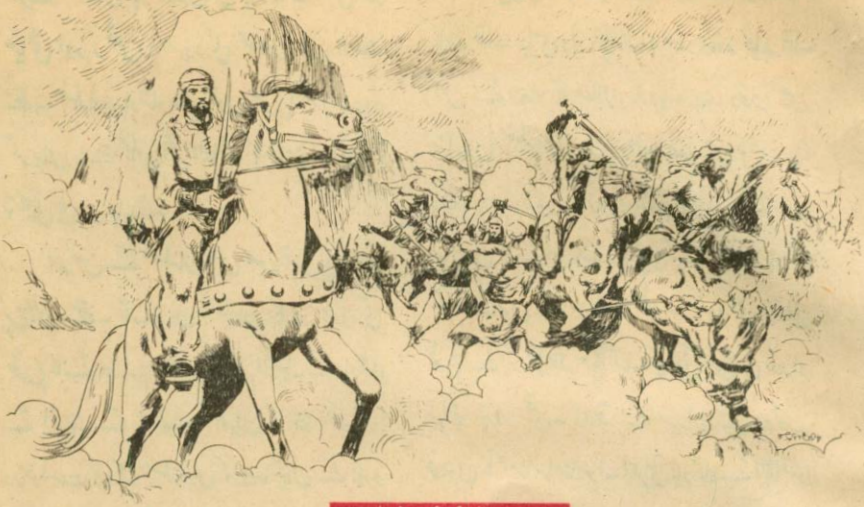

ایک تاریخی مقابلہ

جس نے تاریخ کو پلٹ دیا

طارق ریاض حنان

"اس کی یہ جرأت کہ ہم سے ٹکرلے! ہم مسلمانوں کو تباہ و برباد کردیں گے۔ ہمیں اسلام قبول کرنے کا مشورہ دیتا ہے اور ساتھ لکھتا ہے کہ جزیہ بھی دو، بے وقوف! ہم اور مسلمانوں کو ٹیکس دیں، ناممکن! ارے کئی مسلمان بادشاہ ہمیں خراج دیتے ہیں اور اس افریقی بادشاہ کی یہ ہمت کہ ہم سے دشمنی مول لے!" یہ کہتے ہوئے عیسائی بادشاہ الفانسو نے خط زمین پر دے مارا اور قریب رکھے انگوریوں چبا چبا کر کھانے لگا جیسے وہ لوہے کے ہوں۔ الفانسو عیسائی بادشاہ تھا۔ اپنی ذہانت اور چالاکی کی بدولت اس نے قریبی مسلمان ممالک کے بادشاہوں کو اتنا خوف زدہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنی بقاء کی خاطر عیسائیوں کو سالانہ ٹیکس ادا کرتے تھے۔ الفانسو کا جب جی چاہتا کسی نہ کسی مسلمان ملک میں گھس کر وہاں کے لوگوں کا قتل عام شروع کردیتا۔ دوسری

طرف مسلمان بادشاہوں کی یہ حالت تھی کہ عیاشی اور رقص و سرود کی محفلوں میں مست تھے۔ مسلمان بادشاہ عام دنوں میں باہم دست و گریباں رہتے لیکن اگر الفانسو کا سامنا کرنا پڑجاتا تو بھیگی بلی بن جاتے۔

اندلس کے مسلمان اس صورتحال پر سخت پریشان تھے۔ آئے دن مسلمان گاجر' مولی کی طرح کاٹے جارہے تھے۔ چنانچہ اشبیلہ کے بادشاہ نے افریقہ کے مسلمان حکمران کو خط لکھ کر درخواست کی کہ مسلمانوں کو عیسائیوں کے جبرو ستم سے نجات دلائی جائے۔ ایک وفد خط لے کر افریقی بادشاہ کے دربار پہنچا۔ اس وفد میں بڑے بڑے مسلمان عالم اور سیاست دان شامل تھے۔ انہوں نے مسلمانوں پر ظلم کی ایسی تصویر کشی کی کہ مسلمان بادشاہ سخت متاثر ہوکر بولا "ہم اپنی تلوار اس وقت تک میان میں نہیں رکھیں گے جب تک مسلمان ماؤں بہنوں پر ظلم کا حساب نہ لے لیں۔ الفانسو شاید بھول گیا ہے کہ شہادت ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ شہادت حسینؓ اس بات کی گواہ ہے کہ حق کبھی نہیں جھکتا' کبھی نہیں ہارتا' تم لوگ جاؤ اور جہاد کی تیاری کرو!"

مسلمان بادشاہ کے اس اعلان کے بعد وفد اندلس لوٹ آیا۔

افریقی بادشاہ عابد' زاہد اور نماز روزے کا پابند تھا۔ سیاسی داؤ پیچ کا ماہر اور بہادر مجاہد تھا۔ اس نے جہاد کا اعلان کردیا۔ چند دنوں میں ہزاروں مسلم مجاہد جزیرہ الخضر میں پہنچا دیئے گئے۔ سو بحری جہازوں کے ذریعہ رات دن سپاہیوں کو میدان جنگ پہنچایا گیا۔ الفانسو بادشاہ کو مسلمانوں کے عزائم کا علم ہوا تو وہ بھی عیسائی فوج لے کر طلیطلہ پہنچ گیا۔ عیسائی فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ زلاقہ کے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ افریقی بادشاہ نے الفانسو کو خط کے ذریعے پیغام بھیجا تھا۔ جسے الفانسو نے حقارت سے زمین پر پھینک دیا تھا۔ ساٹھ ہزار عیسائیوں کا مقابلہ صرف بیس ہزار مسلمان حریت پسندوں سے تھا۔ جو سر پر کفن باندھے دل میں شہادت کی آرزو لیے مقابلے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ مسلمانوں کے گھوڑے' اونٹ اور ہتھیار کم تھے۔ اس کے برعکس دشمن کے جانور صحت مند اور ہتھیار زیادہ تھے۔ اندلس کے سپاہی عیسائی فوج کے سامنے کھڑے تھے جبکہ افریقی بادشاہ نے جنگی حکمت عملی کے تحت اپنی فوج پہاڑوں کی اوٹ میں چھپا رکھی تھی۔ عیسائیوں کا خیال تھا کہ اندلس کے چند ہزار سپاہی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

اعلان تو یہ ہوا تھا کہ لڑائی پیر کے دن ہوگی لیکن الفانسو بادشاہ نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے اتوار کو مسلمانوں پر حملہ کردیا۔ مسلمان بھی جوابی کارروائی کے لئے تیار ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھمسان کی جنگ چھڑ گئی۔ اندلسی مسلم فوج نے کم تعداد کے باوجود ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جب مسلم فوج رفتہ رفتہ پیچھے ہٹنے لگی تو افریقی بادشاہ نے اپنی تازہ دم فوج کی مدد سے عیسائیوں کو گھیر لیا اور مغرب کی نماز تک بیس ہزار عیسائی فوجیوں کو تہس نہس کردیا۔ الفانسو زخمی ہو کر بھاگ نکلا۔ باقی فوج بھی زخم خوردہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس فتح نے مسلمانوں کے حوصلے بلند کردیئے۔ بعد ازاں افریقی بادشاہ نے عیاش مسلمان حکمرانوں کو کیفر کردار تک پہنچایا اور باقاعدہ مسلم ریاست قائم کردی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کھانے پینے کی اشیاء سستی ہوگئیں۔ رعایا خوشحال ہوگئی۔ عدالتیں اللہ اور رسولؐ کے احکامات کی روشنی میں فیصلے کرنے لگیں۔ مسلم ریاست اتنی بڑی ہوگئی تھی کہ تین لاکھ مسجدوں میں افریقی بادشاہ کے نام کا خطبہ دیا جاتا تھا۔ یہ کارہائے نمایاں سرانجام دینے والا عظیم فاتح اسلام کا بہادر بیٹا اور افریقی مجاہد یوسف بن تاشفین تھا۔ اسلام کو اس سپوت پر ناز ہے جس نے مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کردیا۔

دُعا
رب سے ہمارے تعلق کا دوسرا نام ہے

ادارہ آنکھ مچولی نے منتخب دعاؤں کے ۱۲ خوبصورت اسٹیکرز تیار کئے ہیں

ایسی دُعائیں
جو نظر کے سامنے ہوں تو اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتیں

۱۲ اسٹیکرز کا ہدیہ ۳۶ روپے صرف

آنکھ مچولی کے پتے پر خط لکھئے یا فون کیجئے

۱۔ پی آئی بی کالونی۔ کراچی فون ۴۹۴۲۰۶۰ / ۴۹۴۸۰۱۰

صحیح ترتیب ـ بنئے ادیب

انعامی تصویری کہانی

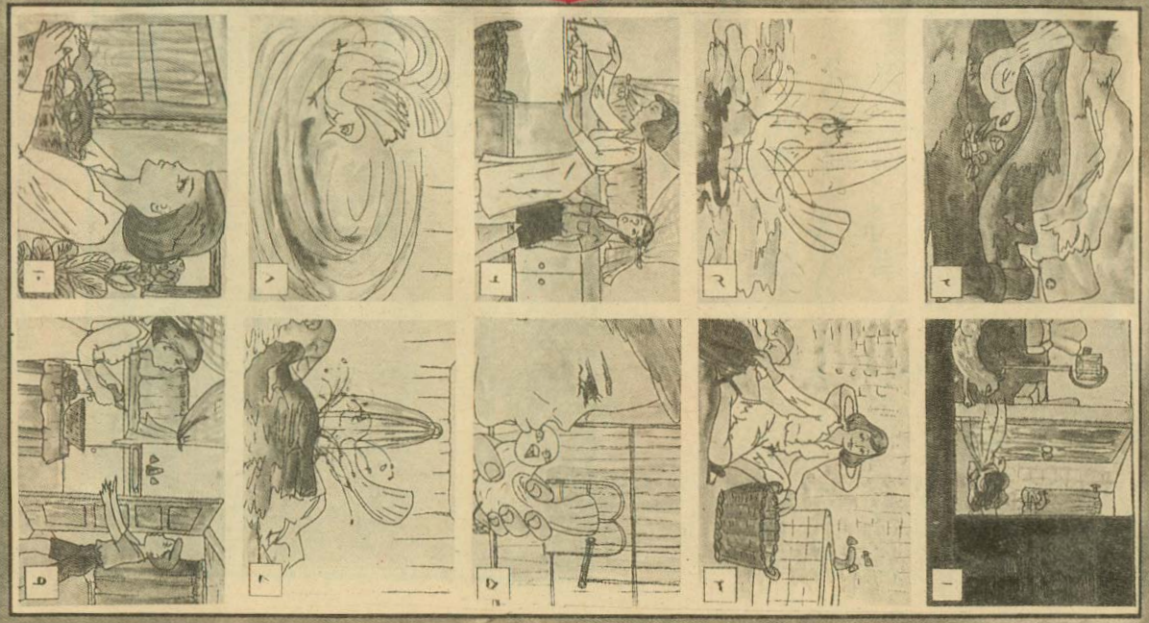

ھینی

اسماء ہارون

تصویروں کی ترتیب درست نہ ہونے کے باوجود اس خوب صورت کہانی کو شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔ صحیح ترتیب اور انعامی کہانی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔

برمنگھم کے پُرفضا و شاداب علاقے میں ایک صاف ستھرے چھوٹے سے قصبے میں میری اور ٹام اپنے والدین کے ساتھ رہتے تھے۔ اپنی پالتو مرغی ہینی سے دونوں بہن بھائی والہانہ محبت کرتے تھے اور ہینی بھی ان سے بہت مانوس تھی۔

☆ --- ☆ --- ☆

پوپھٹنے سے ذرا پہلے ہینی روزانہ بیرونی لان میں جاکر پاس پڑوس کی دوسری مرغیوں کے ساتھ مل جل کر دانہ دنکا چگ لیتی اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میری اور ٹام کی خواب گاہ کے باہر کھڑی ہو کر "کٹ کٹ کٹاک" "کٹ کٹ کٹاک" کا شور مچاتی! دونوں بہن بھائی فوراً نیند سے بیدار ہوکر، نہا دھو کر ناشتہ کرکے اسکول جانے کے لئے تیار ہوجاتے! ہینی کیا تھی گویا بروقت جگانے کا الارم تھی!

☆ --- ☆ --- ☆

آج اتوار ..... چھٹی کا دن تھا۔ حسب معمول میری اپنے اور ٹام کے میلے کپڑے سمیٹ کر باتھ روم جاکر کپڑے دھونے میں مصروف ہوگئی۔ اچانک اسے کچن کے کچھ ضروری کام یاد آگئے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور لپک کر کچن میں پہنچ کر کام میں منہمک ہوگئی! ہینی جو میری کے پیچھے پیچھے باتھ روم پہنچ گئی تھی، میری کے باہر جاتے ہی آٹومیٹک دروازہ بند ہونے کی وجہ سے باتھ روم میں قید ہوگئی۔ جلدی میں میری نل کھلا چھوڑ آئی تھی۔ تیز رفتار پانی کے بہاؤ سے بہہ کر آنے والے ایک کپڑے نے نالی کا منہ بند کردیا۔ جس کی وجہ سے پانی باتھ روم میں جمع ہونا شروع ہوگیا! ہینی بچاری اپنے بچاؤ کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگی، پانی دم بدم فرش کی سطح سے اونچا ہونے لگا۔ ہینی کے پنجے پانی میں ڈوبنے لگے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ پھدک کر کپڑوں کی گٹھڑی پر چڑھ گئی! اپنے تئیں وہ خود کو محفوظ سمجھ کر مطمئن سی ہوگئی۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ کھلے نل کا تیز رفتار پانی عین اس کے سر پر

گر رہا تھا! غریب ہینی کے تو حواس ہی بجا نہ رہے! گھڑی پر اگر کھڑی رہتی ہے تو موسلادھار بارش کی طرح گرنے والے پانی کا سامنا ہے جیسے طبلے پر مسلسل تھاپ پڑ رہی ہو! اور فرش ...... وہاں تو طوفان نوحؑ کا سا منظر دکھائی دے رہا تھا! وہ پانی کی تیز دھار کب تک برداشت کرتی؟ آخر کار چکرا کر گھڑی پر سے نیچے گری .... تیرنا تو اسے آتا نہیں تھا..... بھلا مرغی بھی پانی میں کبھی تیر سکتی ہے؟ بچاری ڈبکیاں کھانے لگی!

☆ --- ☆ --- ☆

ٹام اسٹڈی روم میں اپنا "ہوم ورک" کر رہا تھا۔ اچانک اسے باتھ روم جانے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ دروازہ کھولا تو ہوش ربا نظارہ دیکھ کر ایک دم زور سے چیخا: "سسٹر میری! ہینی ڈوب رہی ہے!" میری سب کام چھوڑ چھاڑ کر برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی آئی۔ "اوہ .... مائی گاڈ!" کہتے ہوئے لپک کر، ڈبکیاں کھاتی ہینی کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا! اور بسرعت ڈریسنگ روم پہنچ کر تولیے سے اس کے گیلے پروں کو خشک کرنے لگی! پھر دوسرے تولیے میں خوب اچھی طرح لپیٹ کر آتش دان کے قریب آن کر بیٹھ گئی!

☆ --- ☆ --- ☆

ٹام کی حالت بھی قابل دید تھی! اس کی معصوم پلکوں پر ستارے سے جھلملا رہے تھے! آتش دان کی نرم، آرام دہ گرمائش سے ہینی کو بڑا سکون ملا اور اس کے حواس تھوڑی سی دیر میں بحال ہو گئے!

☆ --- ☆ --- ☆

"کٹ کٹ کٹاک!" ہینی گویا میری کا دلی شکریہ ادا کر رہی تھی! پہلے ٹام نے اور پھر میری نے باری باری سے اسے بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔

"اوہ! ڈیئر ہینی! تمہارے بغیر تو ہم دونوں بس مر ہی جاتے!" یہ کہتے ہوئے میری نے ہینی کو آہستگی سے بھینچتے ہوئے شدت جذبات سے اس کی چونچ چوم لی!

●●●

مطالعہ

○ مطالعے کے بغیر علم ادھورا ہے۔
○ ذہین بننے کے لئے مطالعہ بھی ضروری ہے۔
○ اچھی کتابوں کا مطالعہ کردار کو اچھا بننے میں مدد دیتا ہے۔
○ مطالعہ کرنے سے ذہن وسیع ہوتا ہے۔
○ مطالعہ شخصیت کو نکھارتا ہے۔

مرسلہ ...... اکمل شاکر، مکران

سیاہ موت

ترجمہ: ناجیہ رفیق گوہر

سیاہ ریچھ پر نظر پڑتے ہی اس کے دماغ میں مقابلہ کا جذبہ جاگ اٹھا۔ اس نے سنا تھا کہ ریچھ کو دیکھ کر بھاگنا موت کو دعوت دینا ہے۔ پس اس نے مقابلے کی ٹھان لی۔

ڈل جانسن (Dale Jonson) اور اس کی ساتھی رانڈا (Rhonda) دونوں جوان تھے۔ اکتوبر کی دوپہر میں جنگل کی سیر کو چلے تھے دوپہر ڈھل چکی تھی۔ رانڈا اس سے چند قدم ہی پیچھے تھی جس کی پیٹھ پر ایک تھیلا تھا۔ رانڈا ستائیس سال کی سنہرے بالوں والی لڑکی تھی اور ڈل اکتیس سال کا مضبوط جسم کا نوجوان جس کے چہرے پر ہلکی سیاہ داڑھی تھی۔ سرد ہوا' خاموش دوپہر' درختوں کی جالدار دھوپ چھاؤں میں دونوں خوش گپیاں کرتے جا رہے تھے۔ ایک موڑ پر ڈل کے کان کھڑے ہوگئے۔ جھاڑیوں کی سرسراہٹ میں اسے کچھ دکھائی دیا تھا۔ اچانک دو بھورے سیاہ ریچھ اس کے سامنے آگئے۔ خوف ناک چمکیلی آنکھیں کھڑے بالوں سے ان کا غضب ناک ہونا ظاہر تھا۔ ڈل کو یاد آیا کہ مقابلہ پر دشمن کو دیکھ کر ڈرنے کے بجائے ڈرانا اور دھمکانا اچھا ہوتا ہے وہ گرجتا' بازو لہراتا مقابلے کو بڑھا۔ ان میں سے ایک ریچھ تو ڈر کر جھاڑی میں

غائب ہوگیا لیکن دوسرا جو پانچ من بھاری تھا حملے کے لئے آگے بڑھا۔

ڈل نے درخت کی ایک مضبوط شاخ، جو اس کی کلائی جتنی موٹی اور مضبوط تھی لے کر کالے شیطان کی کھوپڑی پر دے ماری اور خوفناک نعرہ لگایا۔ اسے معلوم تھا کہ ریچھ کے مقابلے میں اپنی گردن کی حفاظت کرنی ضروری ہے۔ وہ فوراً" زمین پر قلابازی کھا کر گیند کی طرح گول گٹھڑی بن گیا اور کمر اونچی کرلی۔ ریچھ کے نوکیلے پنجے اس کی پیٹھ پر وار کررہے تھے۔

رانڈا نے پہلے تو درخت پر پناہ لینے کے لئے اچھل کر ایک شاخ پکڑنے کی کوشش کی لیکن شاخ اس کے ہاتھ نہ آئی۔ اس نے دیکھا کہ موذی شیطان ڈل کے کندھے کو پکڑ کر بائیں بازو کو اپنے خوف ناک جبڑوں میں لے چکا ہے اور بری طرح بھنبھوڑ رہا ہے۔ "اوہ خدایا" اچانک اسے خیال آیا کہ ایک مرتبہ ایک خوفناک کتے نے اس پر حملہ کردیا تھا۔ جب اس کے ہاتھ میں ٹوکری تھی اور وہ کوڑا پھینکنے جارہی تھی۔ وہ فوراً" چیخی تھی "خبردار! شیطان پیچھے ہٹ جا۔" اور ٹوکری کتے کے منہ پر دے ماری تھی۔ کتا ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ رانڈا نے فوراً" تھیلا اتار کر کالے شیطان کے آگے لہرایا اور ..... "بھاگ شیطان کے بچے" کا نعرہ لگایا۔

ریچھ نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ اپنے شکار کو چھوڑ کر اس نے رانڈا کو گھورا۔ اگلے لمحے وہ رانڈا پر جھپٹا۔ رانڈا نے اس کے زرد ناخن اور خون میں لت پت زبان اور نوکیلے دانت دیکھ کر جھرجھری لی لیکن ہمت نہیں ہاری۔ غضب ناک ریچھ نے اپنے نوکیلے دانت تھیلے پر گاڑ دیئے اور رانڈا کی داہنی کلائی پر پنجہ مارا وہ گھٹنوں بل گری اور بے ساختہ چلا اٹھی۔ اسی وقت ڈل نے بے بس لڑکی کو دشمن کے پنجے میں دیکھ کر زوردار چیخ ماری۔ ریچھ رانڈا کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا۔ ابھی ڈل پوری طرح اٹھ بھی نہ پایا تھا کہ وحشی نے اس کے کولہے پر دانت گاڑ دیے اور ڈل ہوا میں لٹک گیا۔ شیطان ریچھ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھالیا تھا۔

"زمین پر لیٹ جاؤ۔ دم سادھ لو۔" اس نے رانڈا کو بتلایا۔ لیکن وہ ڈل کو خطرہ میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی۔ اپنے پھٹے ہوئے تھیلے کو لے کر رانڈا ریچھ پر حملے کے لئے بڑھی ..... اب درندے نے پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہو کر رانڈا کی گردن پر پنجہ مارا، رانڈا کے بائیں بازو کا اوپری حصہ وحشی کے جبڑوں میں آگیا تھا جسے وہ بری طرح چبا رہا تھا، بہادر رانڈا ریچھ کے نیچے

پڑی تھی۔لیکن اس نے غصہ سے دانت کچکچا کر درندہ کے پیٹ پر مکوں کی بارش کردی۔آخر کار ریچھ ہار کر بھاگ نکلا اور جنگل میں غائب ہوگیا۔

زخمی ڈل ہمت کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔الٹا ہاتھ کم بخت نے ایسے چبایا تھا کہ ہڈیاں نکل آئی تھیں۔کولہے پر ہاتھ لگا تو معلوم ہوا کہ موذی وہاں سے ایک بوٹی لے اڑا تھا۔رانڈا نے قمیض پھاڑ کر کلائی پر پٹی باندھی۔ابھی اس کی گردن اور کندھے سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔"میں نے تمہیں مصیبت میں پھنسادیا۔خیر پروا نہیں۔اب ہمیں اپنی کار تک پہنچنا ہے۔یہاں ویرانے میں مدد کو کون آئے گا۔" رانڈا نے کہا پھر وہ تھیلا دوسرے کندھے پر ڈال کر بڑی ہمت کرکے آگے بڑھی۔زخمی ڈل کو سہارا دیا اور پھر دونوں آہستہ آہستہ چل پڑے۔"گاڑی ابھی تین میل دور ہے۔" اس نے سوچا' اسے یاد آیا کہ ہوٹل میں ویٹرس (Waiters) کی ملازمت شروع کرکے وہ مینجر کے عہدہ تک پہنچی تھی۔ادھر ڈل یونی ورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری لے کر ایک کمپنی کا حصہ دار ہوگیا تھا۔لیکن اس وقت دونوں بری طرح زخموں سے نڈھال تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کی ہمت بندھا رہے تھے۔

ڈل رانڈا کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا لیکن وقفہ وقفہ سے خوفناک قسم کی آوازوں سے نعر بھی لگا رہا تھا تاکہ وحشی درندے دور ہی رہیں۔ زخموں سے چُور چُور کسی نہ کسی طرح وہ گاڑی تک پہنچ ہی گئے۔دن کے ڈھائی بج رہے تھے۔

"اللہ کا شکر ہے۔" ڈل نے کہا۔"اگلی منزل بھی وہی آسان کرے گا۔" یہ کہہ کر وہ تقریباً بے ہوش ہوگیا۔رانڈا بہادر تھی۔تھیلے میں سے گاڑی کی چابیاں تلاش کرکے اس نے دروازہ کھولا اور ڈل کو اگلی سیٹ پر بٹھایا اور خود اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔"گاڑی میں چلاسکتی ہوں۔" اس نے کہا۔اس کا بایاں بازو زخمی تھ اس لئے ڈل دائیں ہاتھ سے گیئر بدل رہا تھا اور رانڈا گاڑی چلا رہی تھی۔اسے چکر آرہے تھے لیکن کسی طرح گاڑی کو قابو میں کرتی رہی۔راستے میں ایک جگہ فون کیا۔"ہم زخمی ہیں ہماری مدد کیجئے۔" آپریٹر نے پتہ نوٹ کیا اور ہسپتال سے ایمبولینس چل پڑی۔ایک گھنٹے کے بعد وہ ہسپتال میں تھے۔زخمی لیکن بہادر جوانوں کو طبی امداد مل گئی۔ڈاکٹروں نے چار پانچ آپریشن کرکے ہڈیاں درست کیں اور کہیں ایک ماہ میں جاکر ڈل اور رانڈا کام پر جانے کے قابل ہوئے۔

●●●

اقراء

خالد بن محمود احمد

سیدھی سی بات تھی' انسان پر انسان کا جبر کیوں ہو؟ انسان' انسان ہی کے آگے کیوں جھکے اور انسان انسان کے ہاتھوں کیوں ذلیل ہو؟ مگر یہ سیدھی سی بات اس عقل کے اندھے کے دماغ میں نہیں بیٹھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ لوگ صرف حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں جیسے وہ خود۔

سمجھانے والا ایک معزز اور باوقار آدمی تھا' اس کے چہرے پر سچائی کا نور تھا اور اس کے لہجے میں حق بولتا ہوا صاف محسوس ہوتا تھا بشرطیکہ وہ محسوس کرنے کے لائق ہوتا۔ مگر اس طرح تو اس کے مفادات پر ضرب پڑتی تھی۔ اسے تختِ خدائی سے اتر کر انسانوں کے درمیان آنا پڑتا تھا۔ طاقت کا غرور اس کے دماغ سے چھلکتا ہوا آنکھوں میں اتر آیا' اب سچائی اسے کیسے نظر آسکتی تھی؟ پھر اس غرور کا ذائقہ اس کے گلے نے محسوس کیا اور وہ غرایا "تم جھوٹے ہو اور جادوگر۔ میں شہر کے لکھے پڑھے جادوگروں کو بلاتا ہوں۔ وہ تم سے مقابلہ کریں گے' تمہیں شکست دیں گے اور تمہاری زبان بند کردیں گے۔"

سمجھانے والا اطمینان سے کھڑا رہا' اسے کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔ کیونکہ اسے اس نے اطمینان دلایا تھا جس کی طاقت سب طاقتوں سے بڑی اور جس کی حکومت لازوال ہے۔ اس لئے کہ وہ اسی کا پیغام بر تھا۔

حکمران کا بلاوا تھا اور انعام کا لالچ۔ آناً فاناً "ماہر' لکھے پڑھے جادوگر جمع ہوگئے اور مقابلہ شروع ہوگیا۔ پہلا وار بھی انہی کے حصہ میں آیا۔ تعداد بھی انہی کی زیادہ تھی اور حکمران کی پشت پناہی بھی انہی کو حاصل تھی۔ مگر یہ کیا؟ یہ تو شاید دنیا کا مختصر ترین مقابلہ تھا۔ باوقار آدمی نے ان کے منتر کا جواب دیا ہی تھا کہ وہ جھکتے چلے گئے۔ وہ سب جھک گئے' اس آدمی کے آگے اور جس نے اسے بھیجا تھا اس کے آگے۔ جھکے اور ایسے والہانہ پن سے جھکے کہ اب انہیں انعام کا لالچ تھا نہ حکومت کا خوف' نہ حکمران کی دھمکیوں کا ڈر۔ جیتنے والے نے مقابلہ ہی نہیں ان کے دلوں کو بھی جیت لیا تھا اور یہ فاتح تھے حضرت موسیٰؑ۔ بدنصیب حکمران فرعون تھا۔

تاریخ حیران ہے کہ اس نے علم کی اہمیت کو تو سمجھ لیا۔ مقابلے کے لئے اُن جادوگروں کو بلایا جو عالم تھے' لکھے پڑھے' مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ علم طاقت کے ساتھ گداز بھی تو لاتا ہے۔ دماغ میں وہ روشنی بھی تو بھرتا ہے جو سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرسکے۔ اسی لئے تو جادوگروں نے ہٹ دھرمی اختیار نہیں کی' دیکھا اور جھک گئے۔ آخر عالم تھے نا.....

مگر جس کو کچھ نظر نہیں آتا تھا' نہیں جُھکا بلکہ جھکنے والوں کو بھی دھمکیاں دینے لگا۔ آخر جاہل تھا نا.....

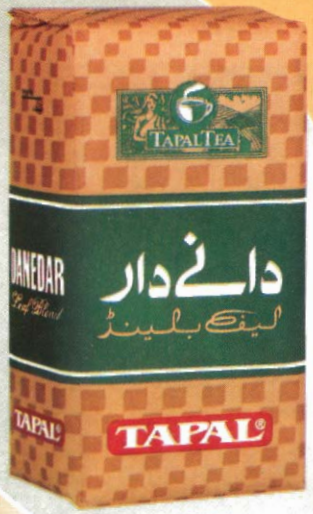

اصل دانے دار
ٹپال دانے دار
باقی سب تو...
TAPAL TEA
DANEDAR
دانے دار
لیف بلینڈ
TAPAL
TAPAL
TAPAL
بھرپور رنگ،
خوشبو اور ذائقہ
LASERDOT
TD-295

REGD. No SS-266 JANUARY 1997
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI